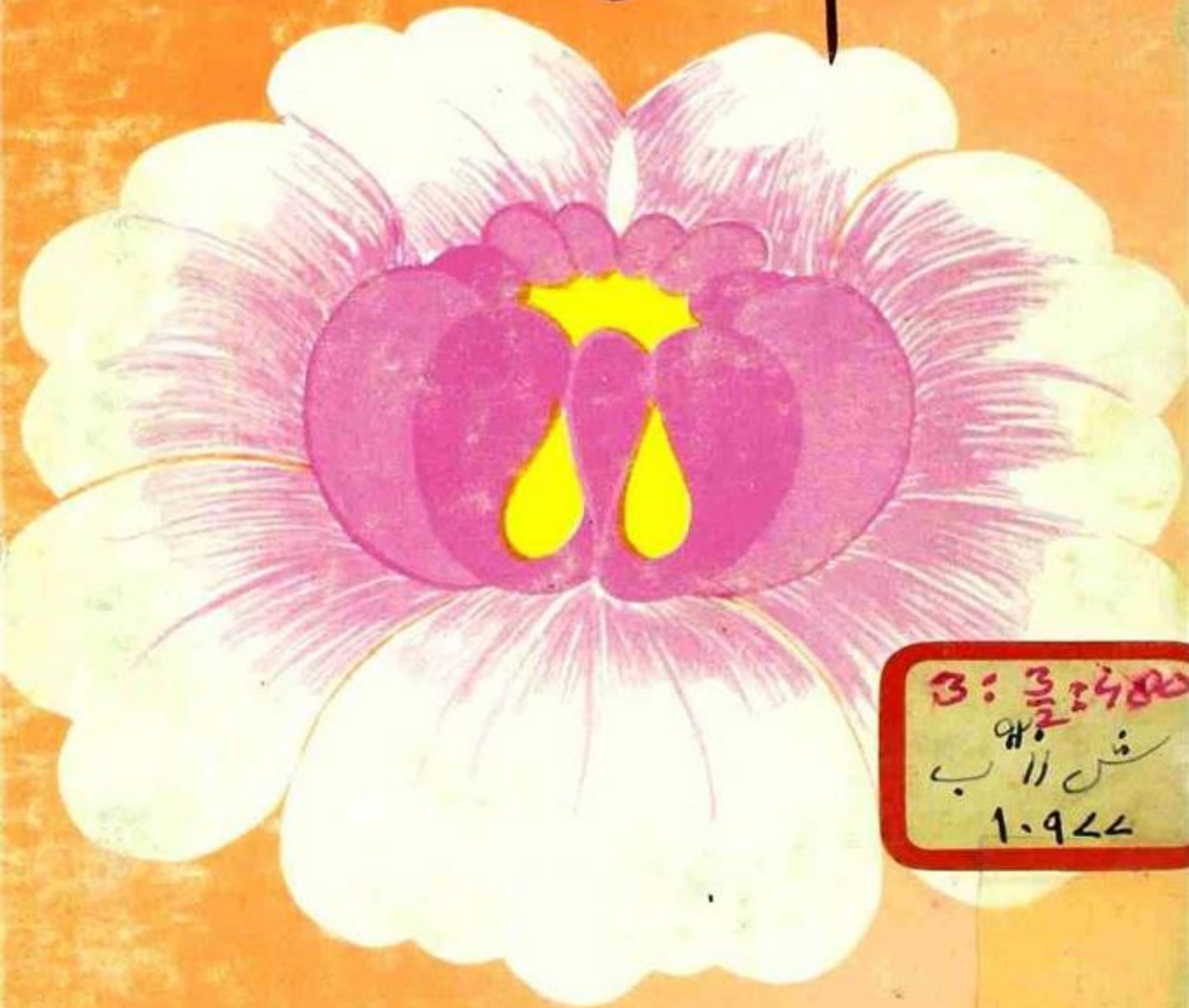


شاہد احمد دہلوی

بزمِ خوشِ تقسال



3: 3: 4: 5: 6: 7: 8: 9: 10: 11: 12: 13: 14: 15: 16: 17: 18: 19: 20: 21: 22: 23: 24: 25: 26: 27: 28: 29: 30: 31: 32: 33: 34: 35: 36: 37: 38: 39: 40: 41: 42: 43: 44: 45: 46: 47: 48: 49: 50: 51: 52: 53: 54: 55: 56: 57: 58: 59: 60: 61: 62: 63: 64: 65: 66: 67: 68: 69: 70: 71: 72: 73: 74: 75: 76: 77: 78: 79: 80: 81: 82: 83: 84: 85: 86: 87: 88: 89: 90: 91: 92: 93: 94: 95: 96: 97: 98: 99: 100: 101: 102: 103: 104: 105: 106: 107: 108: 109: 110: 111: 112: 113: 114: 115: 116: 117: 118: 119: 120: 121: 122: 123: 124: 125: 126: 127: 128: 129: 130: 131: 132: 133: 134: 135: 136: 137: 138: 139: 140: 141: 142: 143: 144: 145: 146: 147: 148: 149: 150: 151: 152: 153: 154: 155: 156: 157: 158: 159: 160: 161: 162: 163: 164: 165: 166: 167: 168: 169: 170: 171: 172: 173: 174: 175: 176: 177: 178: 179: 180: 181: 182: 183: 184: 185: 186: 187: 188: 189: 190: 191: 192: 193: 194: 195: 196: 197: 198: 199: 200: 201: 202: 203: 204: 205: 206: 207: 208: 209: 210: 211: 212: 213: 214: 215: 216: 217: 218: 219: 220: 221: 222: 223: 224: 225: 226: 227: 228: 229: 230: 231: 232: 233: 234: 235: 236: 237: 238: 239: 240: 241: 242: 243: 244: 245: 246: 247: 248: 249: 250: 251: 252: 253: 254: 255: 256: 257: 258: 259: 260: 261: 262: 263: 264: 265: 266: 267: 268: 269: 270: 271: 272: 273: 274: 275: 276: 277: 278: 279: 280: 281: 282: 283: 284: 285: 286: 287: 288: 289: 290: 291: 292: 293: 294: 295: 296: 297: 298: 299: 300: 301: 302: 303: 304: 305: 306: 307: 308: 309: 310: 311: 312: 313: 314: 315: 316: 317: 318: 319: 320: 321: 322: 323: 324: 325: 326: 327: 328: 329: 330: 331: 332: 333: 334: 335: 336: 337: 338: 339: 340: 341: 342: 343: 344: 345: 346: 347: 348: 349: 350: 351: 352: 353: 354: 355: 356: 357: 358: 359: 360: 361: 362: 363: 364: 365: 366: 367: 368: 369: 370: 371: 372: 373: 374: 375: 376: 377: 378: 379: 380: 381: 382: 383: 384: 385: 386: 387: 388: 389: 390: 391: 392: 393: 394: 395: 396: 397: 398: 399: 400: 401: 402: 403: 404: 405: 406: 407: 408: 409: 410: 411: 412: 413: 414: 415: 416: 417: 418: 419: 420: 421: 422: 423: 424: 425: 426: 427: 428: 429: 430: 431: 432: 433: 434: 435: 436: 437: 438: 439: 440: 441: 442: 443: 444: 445: 446: 447: 448: 449: 450: 451: 452: 453: 454: 455: 456: 457: 458: 459: 460: 461: 462: 463: 464: 465: 466: 467: 468: 469: 470: 471: 472: 473: 474: 475: 476: 477: 478: 479: 480: 481: 482: 483: 484: 485: 486: 487: 488: 489: 490: 491: 492: 493: 494: 495: 496: 497: 498: 499: 500: 501: 502: 503: 504: 505: 506: 507: 508: 509: 510: 511: 512: 513: 514: 515: 516: 517: 518: 519: 520: 521: 522: 523: 524: 525: 526: 527: 528: 529: 530: 531: 532: 533: 534: 535: 536: 537: 538: 539: 540: 541: 542: 543: 544: 545: 546: 547: 548: 549: 550: 551: 552: 553: 554: 555: 556: 557: 558: 559: 560: 561: 562: 563: 564: 565: 566: 567: 568: 569: 570: 571: 572: 573: 574: 575: 576: 577: 578: 579: 580: 581: 582: 583: 584: 585: 586: 587: 588: 589: 590: 591: 592: 593: 594: 595: 596: 597: 598: 599: 600: 601: 602: 603: 604: 605: 606: 607: 608: 609: 610: 611: 612: 613: 614: 615: 616: 617: 618: 619: 620: 621: 622: 623: 624: 625: 626: 627: 628: 629: 630: 631: 632: 633: 634: 635: 636: 637: 638: 639: 640: 641: 642: 643: 644: 645: 646: 647: 648: 649: 650: 651: 652: 653: 654: 655: 656: 657: 658: 659: 660: 661: 662: 663: 664: 665: 666: 667: 668: 669: 670: 671: 672: 673: 674: 675: 676: 677: 678: 679: 680: 681: 682: 683: 684: 685: 686: 687: 688: 689: 690: 691: 692: 693: 694: 695: 696: 697: 698: 699: 700: 701: 702: 703: 704: 705: 706: 707: 708: 709: 710: 711: 712: 713: 714: 715: 716: 717: 718: 719: 720: 721: 722: 723: 724: 725: 726: 727: 728: 729: 730: 731: 732: 733: 734: 735: 736: 737: 738: 739: 740: 741: 742: 743: 744: 745: 746: 747: 748: 749: 750: 751: 752: 753: 754: 755: 756: 757: 758: 759: 760: 761: 762: 763: 764: 765: 766: 767: 768: 769: 770: 771: 772: 773: 774: 775: 776: 777: 778: 779: 780: 781: 782: 783: 784: 785: 786: 787: 788: 789: 790: 791: 792: 793: 794: 795: 796: 797: 798: 799: 800: 801: 802: 803: 804: 805: 806: 807: 808: 809: 810: 811: 812: 813: 814: 815: 816: 817: 818: 819: 820: 821: 822: 823: 824: 825: 826: 827: 828: 829: 830: 831: 832: 833: 834: 835: 836: 837: 838: 839: 840: 841: 842: 843: 844: 845: 846: 847: 848: 849: 850: 851: 852: 853: 854: 855: 856: 857: 858: 859: 860: 861: 862: 863: 864: 865: 866: 867: 868: 869: 870: 871: 872: 873: 874: 875: 876: 877: 878: 879: 880: 881: 882: 883: 884: 885: 886: 887: 888: 889: 890: 891: 892: 893: 894: 895: 896: 897: 898: 899: 900: 901: 902: 903: 904: 905: 906: 907: 908: 909: 910: 911: 912: 913: 914: 915: 916: 917: 918: 919: 920: 921: 922: 923: 924: 925: 926: 927: 928: 929: 930: 931: 932: 933: 934: 935: 936: 937: 938: 939: 940: 941: 942: 943: 944: 945: 946: 947: 948: 949: 950: 951: 952: 953: 954: 955: 956: 957: 958: 959: 960: 961: 962: 963: 964: 965: 966: 967: 968: 969: 970: 971: 972: 973: 974: 975: 976: 977: 978: 979: 980: 981: 982: 983: 984: 985: 986: 987: 988: 989: 990: 991: 992: 993: 994: 995: 996: 997: 998: 999: 1000

مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جاہلی

480

بزمِ خوشِ نَمُفَساں

(شخصی خاکے)

شاہد احمد دہلوی

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind),
New Delhi.

مرتبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

مکتبہ اسلوبِ کراچی

اشاعت اول

کتابت

طابع

قیمت

۶۱۹۸۵

نسیم اختر سہالیوں
عظیمی پرنسز ناظم آباد کراچی
پنیا ایس روپے



Abdullah Tahir (Punjab)
1910-1911

مکتبہ
اسلوب

پوسٹ بکس ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸

انتساب

میری اپنی بھابھی

محترمہ عاصمہ بیگم شاہد احمد دیلوی

کے نام

جمیل جاہلی

تربیت

اس کتاب کے بارے میں
شاہد احمد دہلوی
صاحب طرز ادیب

ڈاکٹر جمیل جالبی - ۷
ڈاکٹر جمیل جالبی - ۱۱
ڈاکٹر جمیل جالبی - ۲۷

مولوی عبدالحق - ۳۵

مولانا عبد السلام نیازی - ۴۹

شوکت تھانوی - ۵۹

مولانا نیاز فتحپوری - ۷۴

فیض احمد فیض - ۸۰

مولانا صلاح الدین احمد - ۸۹

علامہ راشد الخیری - ۱۰۹

قاری سرفراز حسین - ۱۱۷

آغا شاعر قزلباش - ۱۲۶

کرشن چندر - ۱۳۳

حفیظ جالندھری - ۱۴۵

ڈپٹی صاحب (انتصار حسین) - ۱۶۵

نفاست حسین - ۱۷۴

وے صورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں

میر باقر علی داستان گو - ۱۸۹

میر جالب دہلوی - ۱۹۳

شمس العلماء - مولوی عبدالرحمن - ۱۹۴

خواجہ ناصر نذیر فراق - ۱۹۶

نواب سائل دہلوی - ۱۹۹

مولوی احتشام الدین - ۲۰۱

مرزا چاچی - ۲۰۳

نواب تابیان - ۲۰۶

ملا واحدی - ۲۰۷

پنڈت امر ناتھ ساحر - ۲۰۸

خلیقی دہلوی - ۲۰۹

مرزا حیرت دہلوی - ۲۱۰

نہال سیو باروی - ۲۱۱

شاہد احمد دہلوی - کوائف و تصانیف - ۲۱۴

اس کتاب کے بارے میں

۱۹۴۷ء میں ”آزادی“ آئی تو خون کی ہولی کھیلتی ہوئی آئی۔ لاکھوں انسان، معصوم و بے قصور انسان، موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ صدیوں پُرانی آبادیاں اُبھڑ گئیں اور کروڑوں کی تعداد میں لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر، صرف یادوں کا سرمایہ لیے، ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے گئے۔ جو تھا وہ نہ رہا اور جو رہا، وہ اب کچھ اور تھا۔ تہذیبوں کے روپ بدل کر نئے روپ اختیار کرنے لگے۔ یہ سب کچھ میری نسل کا ایک اُن مٹ بخریہ اور ہمارے شعور کا ایک زندہ حصہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب زخم بھرنے لگے، احساسِ درد کم ہوا اور کرب کی چھین دبنے لگی تو ان یادوں نے سر اٹھانا شروع کیا جو شعور کے مہاں خانے میں سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ میں نے شاہد احمد دہلوی کی تریانی ان یادوں کی دل چسپ کہانیاں سن کر کہا کہ ”اگر وہ انہیں لکھ دیں تو یہ سب محفوظ ہو کر ہمارے ادب، ہمارے ماضی، ہماری تاریخ اور اس دور کی روح کی ترجمان بن جائیں گی۔“

اُس زمانے میں یادوں کا اظہار اُن کا روزمرہ بن گیا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتے رہتے۔ اور میں اُن سے کہتا۔ ”شاہد بھائی! یہ سب کچھ لکھ دیجیے۔“ اس بات کو کئی مہینے گزر گئے۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں انہوں نے ان یادوں کو سیٹنے کے لیے قلم اٹھایا اور ان کا پہلا مضمون ”خربطہ خیال“ کے نام سے ماہنامہ ”ساقی“ کراچی کے جنوری و فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں دلی کی چند قابل ذکر شخصیتوں کا دل چسپ انداز میں اس طور پر ذکر کیا گیا تھا کہ گزرتے ہوئے دنوں کی یادوں بھری تصویریں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اُس مضمون کو نہ صرف میں نے بلکہ بے شمار پڑھنے والوں نے پسند کیا اور شاہد صاحب کو دل کھول کر داد دی۔ ۱۹۵۴ء میں شاہد احمد دہلوی نے اُس

مضمون کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک طویل مضمون "دلی کی چند ادبی شخصیتیں" کے نام سے لکھا، جو "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر (جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ان شخصیتوں کے کردار، عادات و خصائل، اطوار اور رنگ ڈھنگ کو اپنے مخصوص لہجے، زبان اور انداز میں اس طور پر بیان کیا کہ ان کرداروں کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے شعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ "خریطہ خیال" میں تاثرات غالب تھے۔ اس مضمون میں خاکہ نگاری کا رنگ گہرا تھا۔ تین سال بعد ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور کے ۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شاہد صاحب نے ایک اور مضمون "وے صورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں" کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں ان کے انداز بیان میں اور رچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ زبان میں حسن اور بیان میں زنجینی بڑھ گئی تھی۔ کرداروں کے نقوش اُجاگر ہو کر تکیے ہو گئے تھے۔ یہ مضمون اتنا پسند کیا گیا کہ ہر طرف سے ایسے مضامین لکھنے کی فرمائشیں آنے لگیں۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ میں اور شاہد بھائی ہربات، ہر مشورے میں ایک دوسرے کے شریک تھے اور جہاں جاتے، ساتھ جاتے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے شاہد بھائی سے کہا۔ کہ یہ چھوٹے چھوٹے خاکے ہیں۔ اگر ان شخصیتوں کے پورے خد و خال اُجاگر کیے جائیں اور ہر ایک کے بارے میں الگ الگ مضمون یا خاکے لکھے جائیں تو یہ بڑا کام ہوگا۔ فہرست بنائی گئی جو بہت طویل تھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ جن شخصیتوں کا ذکر ان مضامین میں آیا ہے پہلے ان پر پورا مضمون (خاکہ) لکھا جائے۔ اسی عرصہ میں شاہد صاحب نے خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی، عنایت اللہ دہلوی، استاد بیخود دہلوی، سرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ پر خاکے لکھے اور ان خاکوں کو دوبارہ لکھا جو وہ پہلے لکھ چکے تھے اور جن میں منٹو، میراجی وغیرہ کے خاکے شامل تھے۔ یہ سب خاکے ۱۹۶۲ء میں مکتبہ نیا دور سے "گنجینہ گوہر" کے نام سے شائع ہوئے۔ تخلیقی اختیار سے یہ شاہد احمد دہلوی کا بہترین دور تھا۔ انہیں راستہ مل گیا تھا اور وہ مسلسل دلی کے موضوع پر مضمون لکھ رہے تھے۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی اور بیان کا زور انہیں دہلوی میں ملا تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے متعدد مضامین لکھے جو بعد میں "اُبھڑا دیار" کے نام سے کتابی شکل میں مکتبہ دانیال سے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ بمبار ہو گئے اور ۲۷ مئی

۱۹۶۷ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک جن شخصیتوں کے خاکے انہوں نے لکھے تھے وہ تو گنجینہ گوہر میں شائع ہو گئے۔ لیکن کچھ خاکے جو ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان لکھے گئے، وہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکے تھے اور مختلف رسائل و جرائد میں پکھرے پڑے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد میں نے "ساتی" کا "شاہد احمد دہلوی نمبر" مرتب کیا۔ تو ارادہ تھا کہ باقی خاکے بھی مرتب کر کے شائع کرادوں گا۔ ۱۹۶۲ء سے میں "تاریخ ادب اردو" لکھنے میں خود اتنا مصروف ہوا کہ کوئی اور کام کرنے کی نوبت ہی نہ آئی، لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو جلد شائع ہونا چاہیے۔ پچھلے سال مجھے ذرا سی فرصت ملی تو میں نے وہ تمام رسالے نکالے جن میں یہ خاکے شائع ہوئے تھے۔ ان خاکوں کو جمع کیا، انہیں پڑھا اور تصحیح کی۔ جن کے اصل مسودے میرے پاس تھے ان سے مقابلہ کیا اور یہ کتاب کم و بیش مرتب کر دی۔ ابھی یہ کام یوں ہی پڑا رہتا اگر برادر مہمنفق خواجہ صاحب اس مجموعے کو جلد شائع کرنے کا تقاضا نہ کرتے۔ میں نے لگ کر اس کام کو پورا کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی۔ وہ شخصیتیں جن کے بارے میں شاہد احمد دہلوی نے دو تین بار لکھا۔ ان کے سب واقعات کو، اس شخصیت کے تحت، ایک جگہ کر دیا ہے۔ جن شخصیتوں پر انہوں نے اختصار سے لکھا لیکن بعد میں ان پر تفصیل سے پورا مضمون لکھا، اس کتاب میں یہ پورا مضمون لے لیا ہے اور مختصر مضمون کو اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ پورے مضمون میں سب باتیں آگئی ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں ۱۳ پورے خاکے اور ۱۳ مختصر خاکے یعنی کل ۲۶ خاکے شامل ہیں۔ یہ سب خاکے جہاں زبان و بیان اور شخصیت کے انوکھے پن کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، وہاں یہ سب پہلی بار کتابی صورت میں مرتب و یک جا ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جہاں "ساتی" کے ذریعے کم از کم تین نسلوں کی آبیاری کی، وہاں یہ خاکے اردو زبان و ادب کے وہ رنگین اور خوشبودار پھول ہیں جو ہمیشہ تازہ رہیں گے۔

کتاب کی ترتیب میں میں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ایک مضمون شاہد احمد دہلوی کے

بارے میں اور ایک مضمون اُن کے اسلوب بیان کے بارے میں لکھ کر شامل کیا ہے، اور
آخر میں شاہد صاحب کی مطبوعہ تصانیف و تراجم کا اشاریہ اور اُن کی زندگی کے مختصر حالات
کو اٹک بھی شامل کر دیے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کے مطالعے سے جہاں شاہد احمد دہلوی
کی سدا بہار تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں، وہاں اُن کی شخصیت اور ان کی ذات کے بارے میں
ضروری معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی، خدا انہیں کروٹ کروٹ چین دے، صحیح معنی میں ایک بڑے
آدمی تھے۔ ایک تاریخ ساز مدیر تھے۔ ایک صاحب طرز ادیب تھے، جن کی یادیں میری
زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اب نہ شاہد صاحب ہیں اور نہ "ساقی" ہے لیکن اُن کی تحریریں
آج بھی ہمارے ذوقِ ادب کو سیراب کر رہی ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرے صحبت نہیں رہی

جمیل جالبی

شاید احمد دہلوی

جب میں اُس دکان میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے دیکھا ڈھیلی ڈھالی گہرے کھنٹی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہوا سیاہ رنگ، پھیلی ہوئی کھڑی ناک، مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہونٹ، مٹھ میں پٹری، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، ڈاڑھی موچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر ذرا سی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دکان تھی۔ بہت سے خریدار آ جا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر اُن صاحب سے سلام دُعا کرتے۔ احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلا خیر عافیت پوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ میں نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا جو اُن سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے بولے — ”شاید احمد دہلوی ہیں۔“ یہ نام سننے ہی میرے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ شاید صاحب کا نام میں نے سیکڑوں بار سنا اور پڑھا تھا۔ اور اُن سے ملنے کی تمنا ایک زمانہ سے مٹھی۔ چوں کہ دکان میں بہت لوگ کھڑے تھے، میری ہمت نہ ہوئی کہ میں اُن سے ہاتھ ملاؤں۔ کچھ دیر الگ کھڑا اُن کو ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مجھے دیکھنے لگے ہیں، میں دکان سے باہر آ گیا۔ شاید صاحب اس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان اور اس میں کئی کنبے۔ نہ بجلی نہ پانی۔ ابھی بن رہے تھے۔ ایک دن میں ملنے کے ارادے سے چلا۔ ٹری مشکل سے مکان ملا۔ شاید صاحب مہل کا کرتا پہنے، تہبند یا ندھے پلنگ پر

بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سوُرج غروب ہو چکا تھا۔ تارہ کی تیزی کے ساتھ اپنا جال بن رہی تھی۔ میں نے کہا: "شاید صاحب! میں آپ سے ملنے آیا ہوں" مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ کہا۔ "آئیے یہیں بیٹھ جائیے" اندر سے لیمپ منگوا یا جو کراچی کی تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی بجھ گیا۔ پھر لائٹن منگوانی جو کچھ دیر تو ٹھیک ٹھیک جلتی رہی، اور پھر ایک دم بھر کنے لگی۔ اتنے میں کوئی بچہ اُسے اٹھا کر اندر لے گیا۔ اسی اندھیرے میں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ دُنیا زمانے کی باتیں، فساد کے قصے، دلی کا ذکر، اور نہ جانے کیا کیا۔ کہنے لگے۔ "بہت سوں کو تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا۔ جس میں میرے انتقال پر ملال کے بارے میں تعزیتی جلسہ اور تدارک کا ذکر کیا تھا، مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ جما جمایا سارا کام بچھ گیا۔ دلی چھٹ گئی۔ بہار کالونی میں مکان بنوا رہا ہوں۔" میں کئی گھنٹے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اُن کے اخلاق اور خلوص کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا اور پھر ہمارے تعلقات اتنی تیزی کے ساتھ بڑھے کہ وہ میرے دکھ درد میں اور میں اُن کے دکھ تکلیف میں ساتھ۔ اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا بڑھ گیا۔ شام کو ہم ساتھ جاتے، چائے پیتے، بے مقصد گھومتے۔ میں نے قدم قدم پر اُن کے خلوص اور محبت کو محسوس کیا۔ شاید صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی دوستی پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ کچھ دن بعد شاید صاحب نے بہار کالونی کا مکان فروخت کر دیا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی۔ تمام دیواروں میں شور اور سیل۔ پیرا ہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا اور یہیں اُٹھ آئے۔ میں نے بھی ایک مکان یہیں خرید لیا تھا۔ جب جی گھبراتا اور کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تو میں ان کے ہاں چلا جاتا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا، گپیں لڑاتا اور چلا آتا۔ جی ہلکا ہو جاتا۔ ساری کوفت دور ہو جاتی۔ اگر میں ایک آدھ دن نہ جاتا تو خود آتے اور نہ آنے کی وجہ پوچھتے۔

فسادات کے بعد کون سی مصیبت تھی جو اُن پر نہ ٹوٹی۔ دوست دشمن ہو گئے اپنے بیگانے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر دلی کے پرائے قلعہ میں آ پڑے۔ کئی دن وہاں رہے۔ مصیبتیں جو سب نے جھیلیں، ان سے زیادہ انھوں نے جھیلیں۔ زندگی بھر

آرام سے گزری تھی۔ مصیبت یا پریشانی کا ہے کو دیکھی تھی۔ یہاں کئی دن دُھوپ، بارش، بدبو، اور تعفن میں چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ پڑے رہے۔ اور پھر ایک دن ہماہجرین کی ٹرین میں بیٹھ کر راستے کی صعوبتیں اور حملے برداشت کرتے لاہور آگئے۔ اور جب لاہور میں کچھ نہ ہوا تو کراچی آ پڑے۔ اور اپنا پرانا مشغلہ پھر سے شروع کر دیا اور وہ پونجی، جو ساتھ لاسکے تھے، اسی پر گنوا دی۔ دہلی کی ساری جائیداد اور کتب خانہ کچھ کسٹوڈین صاحب کی منتظم نظریاتی کی نذر ہو گیا، اور کچھ خورد برد ہو گیا۔ "ساتی" آج تک کبھی فائدہ میں نہیں چلا تھا۔ کراچی میں تو کیا چلتا۔ لوگوں کو گھربار اور دال روٹی کی پڑی تھی، کتابیں اور رسالے کون پڑھتا۔ مہذب اور کلچر کی باتیں کون سُنتا۔ شاہد صاحب کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ صدمہ پر صدمہ، بڑا کنبہ، کھانے والے سب اور کمانے والا کوئی نہیں۔ شاہد صاحب اگر ساتی نہ نکالتے اور کمانے بچانے کا شوق نہ ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکتے۔ کچھ ساتی میں مصروف رہے، اور کچھ گانے بجانے میں۔ بڑے دن گزر گئے۔ بات پرانی ہو گئی، غم ہلکا ہو گیا۔

اس عرصے میں سب کچھ ہوا لیکن شاہد صاحب کی وضع داری میں فرق نہیں آیا۔ اس مصیبت کے زمانے میں نہ اٹھوں نے کسی کی خوشامد کی، نہ کسی سے گم کر بات کی، نہ کہیں خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ بے وطنی اور غربت میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ کینے اور شریف کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے۔ لیکن اٹھوں نے اپنی خود چھوڑی نہ وضع بدلی۔ نہ سبک سمر بن کر کسی سے سرگرائی کی وجہ پوچھی اور یہ بات ان کے کردار کا وہ جوہر ہے جو گنتی کے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات ان کی سادگی ہے۔ جھوٹی عزت ان کو پاس سے چھو کر نہیں گزری۔ تہ بند باندھے چلے آ رہے ہیں۔ کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی بُرائی، نہ کسی کی غیبت۔ سب پر فقرے چسٹت کریں گے۔ سب کا ذکر کریں گے۔ مزالیں گے۔ مذاق اڑائیں گے جس قسم کی صحبت میں بیٹھیں گے، اُس میں گھل مل جائیں گے۔ بُدھوں میں بُدھے، جوانوں میں جوان اور بڑوں میں بڑے۔ ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔ اپنی ملاقات کی تفصیل سنائیں گے۔ لچھے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی

ہنسیں گے اور سُسنے والوں کو بھی ہنسائیں گے۔ گھنٹوں صبح رہے گی۔ اچھی بُری ہر قسم کی بات کریں گے۔ شاہد صاحب سے باتیں کرتے وقت آدمی سب کچھ بھول کر ایک الگ دُنیا میں کھو جاتا ہے۔ جہاں خلوص، ہنسی، دل چسپی، ادب اور موسیقی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قصے ہوں گے۔ اُن کے بھی جو مَر گئے، اُن کے بھی جو جیتے ہیں اور اُن کے بھی جو ابھی اُبھر رہے ہیں۔ ادیبوں کا ذکر آئے گا۔ اُن کی اچھی بُری عادتوں کا ذکر کریں گے۔ چال چلن، اطوار اور حماقتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ کھل کر اُن کے لین دین، مروت، معاملہ، شراب، عورت، شادی بیاہ، عشق اور ہوس کا ذکر کریں گے۔ ایک دن صرے میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ دتی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجاز بھی تھے۔ مجاز شراب کا رسیا، عورت کا عاشق۔ بات چل نکلی۔ مجاز نے شراب پی پی کر اپنی صحت شراب کر لی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا: "مجاز مَر جاؤ گے" مجاز نے بے ساختہ کہا: "شاہد صاحب سے

موت بھی اس لیے گوارا ہے

موت "آتا" نہیں ہے "آتی" ہے

کہنے لگے حیدر آباد میں جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش شراب پی رہے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ دُور چل رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "شاہد صاحب! آپ بھی پیجیے۔ میں نے انکار کیا۔ ان کا اصرار بڑھا۔ جب اُدھر سے اصرار اور اُدھر سے انکار بڑھا تو جوش اپنے مخصوص انداز میں بولے

"ساتی" کے "دیر" اور نہیں ہیں محمود

پر عکس مہند نام زندگی کا فوڈ

ہر ایک سے ملتے ہیں اور کھل کر ملتے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو، لیکن ملیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کے نئے واقف کار نہیں، پُرانے دوست ہیں۔ ایسے موقع پر سہرہ دی کی باتیں کریں گے اور مفرد مجس جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اٹنی کی وجہ سے پیرٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ادیب بھی ہیں اور ڈوم ڈھاری بھی۔ بات کرتے میں چلتی پھرتی گالیاں بھی دیں گے۔ چیر پھاڑ بھی کریں گے، مگر سنجیدگی و طبع موجود رہے گی۔ "ساتی" جرب کراچی

سے نکلا تو ساتی کے پُرانے منشی بھی یہیں کام کرنے لگے۔ اُن سے بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے مزے لیتے۔ کام کرتے جاتے، فقرے کُتتے جاتے۔ ایک دن شاہد صاحب، منشی جی اور میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ منشی جی اپنی بیوی سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ بڈھے آدمی ہیں لیکن اُس کے بُرے سلوک کے ایسے شاک کی کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ شاہد صاحب بہت دیر تو سنتے رہے۔ پھر ایک دم بولے۔ "کیوں بھئی! تمہاری" سو تیلی بیوی "ہیں؟" اور پھر ہنسنے لگے۔

مارٹن روڈ پر سرکاری کوالڈ ٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھس گئے۔ بلا تکلف اندر کمرے میں آگئے۔ شیروانی اتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی، کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی۔ غیر مردوئے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی لیے اور دونوں ہاتھوں سے دستاں تھامتے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے اور چلانے لگیں۔ انھوں نے معذرت چاہی۔ کہنے لگے۔ "جمیل صاحب اقرب قیامت ہے۔ ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے۔" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ شاہد صاحب ہنستے بڑے مزے سے ہیں۔ پہلے بات کہیں گے مزے لے لے کر، تفصیل کے ساتھ۔ بات کے دوران میں وہ بالکل سنجیدہ رہیں گے۔ سُننے والا مُسکراتا رہے گا جب بات ختم ہو جائے گی تو پھر گہری گہری آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اور یک لخت زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔ پھر ہنسی کا غوطہ لگائیں گے اور پھر ہموار ہو جائیں گے۔ اُن کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھنگھور گھٹا میں ابابیل سیدھی اُڑتے اُڑتے بھیگی بھیگی فضا میں غوطہ لگاتی ہے اور پھر سیدھی اُڑتے لگتی ہے۔ پھر غوطہ لگاتی ہے اور سیدھی اُڑتے لگتی ہے۔

شاہد صاحب کو شاعروں سے چڑھ ہے۔ چڑھ ان معنی میں نہیں کہ وہ شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان معنی میں کہ شاعروں کو سنانے کا مرض ہوتا ہے اور انھیں سُننے سے اللہ واسطے کابیر ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑے کھرے ہیں۔ صاف صاف لحاظ

مردّت کو بالائے طاق رکھ کر سختی سے انکار کر دیں گے۔ کہنے لگے: "جمیل صاحب، اگر میں ایسا نہ کروں تو میری زندگی عذاب بن جائے۔ مجھے سڑک پر، ہوٹل میں، بسوں میں، گھروں پر، دعوتوں میں، ہر جگہ غزلیں سنانے لگیں" — دو تین سال پہلے کی بات ہے، ایک صاحب لکھنؤ سے آئے۔ طبیبہ بجاتے تھے۔ موسیقی کے سلسلے میں شاہد صاحب کی تعریف سنی تھی۔ شاہد صاحب سے ملنے آئے۔ "کنڈہم جنس باہم جنس پروانہ" کے مصداق پھر روز آنے لگے۔ اپنے طبیبے کی بہت ڈینگیں مارتے۔ کئی محفلوں میں انھوں نے طبیبہ بجایا۔ شاہد صاحب نے تعریف کی۔ کچھ مردّت سے، کچھ ویسے ہی، اتائی تھے۔ ایک دن گاتے بجانے کی ایک محفل میں مصر ہوئے کہ شاہد صاحب میرے ساتھ گلیے۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے — لیکن طبیبہ بجاتے وقت وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی صورت میں گانے والے پر غالب آجائیں اور شاہد صاحب کو، "من چہ می سرایم" کا احساس ہو جائے۔ شاہد صاحب نے جب یہ دیکھا تو ایسے استادانہ انداز سے راگ گایا کہ کچھ دیر بعد طبیبہ صاحب عاجز ہو گئے۔ شاہد صاحب نے کہا: "میر صاحب! کیا بجا رہے ہیں؟" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

یہی صاحب ایک دن تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سال نامے کی تیاری تھی۔ کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں۔ وہ فرمائے لگے۔ "شاہد صاحب میں نے ایک غزل کہی ہے، ذرا سن لیجیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی" — شاہد صاحب نے انہیں دیکھا۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگے: "صاحب، مردّت میں ایک دفعہ برا کام کرایا جاسکتا ہے مگر غزل نہیں سنی جاسکتی۔ ایک دفعہ میں غزل سن چکا ہوں۔ اب بار بار تو یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔" وہ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ مگر شاہد صاحب کا پیچھا اس پر بھی ان سے آج تک نہیں چھوٹا۔

ایک دن ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط میری طرف بٹھایا۔ بولے: "پڑھ لیجیے" اُس میں لکھا تھا: "مکرجی، غزل روانہ ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے کہی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ براہ کرم "ساقی" میں نمایاں طور پر شائع فرما کر ممنون فرمائیے"

خط پڑھ کر میں نے واپس کر دیا۔ کہنے لگے: "جمیل صاحب، کیا سائے کو ٹائٹل پیج پر چھاپ دوں؟"

ایک دن باتوں باتوں میں سرکاری افسروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے: "یہ سائے ہر وقت اور ہر جگہ افسر ہی رہتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ایسے لائق افسر بڑے ہیں کہ جو جس کام پر لگایا گیا ہے بس وہی کام اُسے نہیں آتا۔" ایک محکمے کے ایک بڑے افسر کا ذکر کرنے لگے۔ وہ طباعت کے نگران تھے۔ ایک صاحب اُن کے پاس گئے۔ اُن کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے مسخرے اور منہس مکھ۔ اُن سے کہنے لگے: "صاحب، آپ کی سرکاری طباعت میں لفظوں میں ذرا بھی چمک نہیں ہوتی۔ شاید آپ کتابت کے بعد مسطر پر زیتوں کا تیل نہیں پھرتے؟" یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی گئی تھی۔ انہوں نے فرمایا: "نہیں تو"۔ "یہی وجہ ہے کہ الفاظ چکنے نہیں ہوتے۔" یہ تو کاتب کا کام ہے کہ وہ کتابت کے بعد مسطر پر تیل کا پچا پھیرے، وہ غصے میں بھر گئے۔ فوراً انچارج کاتب کو بلا یا، ڈانٹا اور کہا: "عجیب بات ہے کہ آپ اپنے تجربہ کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن زیتوں کا تیل تک مسطر پر کتابت کے بعد نہیں پھرتے؟" کاتب یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ کہنے لگا: "صاحب!"۔ "صاحب داب کچھ نہیں، آئندہ سے خیال ہے۔" کاتب چلا گیا۔ وہ صاحب ہنسنے لگے۔ "یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

شاید صاحب چلے کے بہت دھنی ہیں۔ دن میں بیسیوں پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اس میں اچھی بڑی کی کوئی تخصیص نہیں۔ چائے ہو اور بس۔ مہینہ میں پندرہ سو بیڑیاں پی جاتے ہیں۔ ساتی کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ایک دن حسب معمول بنیان پینے، تہ بند بانڈھے زمین پر بیٹھے پوچھ پیک کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ میں نے کہا: "شاید صاحب، ایسے میں آپ کی تصویر لے لی جائے۔" زور سے ہنسنے، کہنے لگے: "ہاں اس کے نیچے لکھ دینا۔" "پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا حشر۔"

گلانے کے رسیا ہیں اور فن کے استاد۔ ہندوستان و پاکستان میں ایک ادنیٰ شخص

ایسا ہوگا جو اس فن سے ایسا واقف ہو جیسے کہ شاید صاحب ہیں۔ میں نے بڑے بڑے خاندانی خان صاحبوں کو ان کے سامنے عقیدت مندانہ طریقے سے بیٹھے دیکھا ہے۔ استاد بندو خان میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ سازنگی بجانے سے پہلے کم از کم تیس چالیس منٹ تک بھری محفل میں سازنگی کے تاروں کو چلاتے رہتے ہیں۔ سامعین بیٹھے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہر محفل میں ان کی یہ روش قائم رہتی ہے۔ کس کی مجال کہ کوئی ان سے کچھ کہے۔ اپنے فن کے لائق فن کار۔ ناراض ہو جائیں یا رُوٹھ جائیں تو پھر منائے نہ منیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب شاید صاحب ان کو غصے بھرے لہجے میں ڈانٹ دیتے ہیں یا پھر جل کر اس غصے میں کسی اور کو گوا دیتے ہیں، تو وہ ان کی بات ایسے سن لیتے ہیں جیسے کوئی ان کے استاد یا بزرگ ہوں۔ وہ اس فن پر لکھ بھی ماہرانہ انداز سے لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ گام بھی استادانہ طریقے پر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بیسیوں دفعہ سنا۔ ریڈیو پر بھی اور محفلوں میں بھی۔ گانے والے کے جو ہر محفل میں کھلتے ہیں۔ شاید صاحب جب محفل میں گاتے ہیں تو وہ لوگ بھی جو کلاسیکل موسیقی سے ناواقف ہیں، تال اور سردوں کے زیر و بم اور اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن میرے ہاں محفل تھی۔ کراچی کے سب مشہور گویے اور سازندے جمع تھے۔ رات کے تین بجے تھے۔ شاید صاحب کی باری آئی۔ سب نے آنکھیں ملیں، پہلو بند لے اور انہیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاید صاحب سامنے آئے۔ طبیحی نے طبلہ کھڑکھڑایا۔ سازنگی نے سازنگی کے تار کسے۔ ستارہ نے ستار کی کھونٹیاں گھمایں۔ ایک شاگرد نے تانپورہ سنبھالا۔ شاید صاحب نے گانا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹہ گائے۔ ایسا سماں باندھا کہ سب محو ہو گئے۔ محفل کو سانپ سا سونگھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی جادوگر نے ساری محفل کو باندھ دیا ہے۔ ڈھلتی رات، چاروں طرف فضا میں ستارا، وقت کی راگنی، مال کوس، گارہے تھے۔ ترانہ میں "تانا دیم" کی تکرار پر ستارہ اور سازنگی ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ گویا تاروں کی موسیقی سے بہت آگے نکل گیا۔ طبیحی بے قابو ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں رس گھل رہا ہے۔

گاتے اُونچی آواز میں ہیں۔ بول بہت یاد ہیں۔ بیسیوں شاگرد ہیں۔ سب استاد کہتے ہیں۔ طبلہ، سازنگی اور دوسرے ساز کمرے میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈوم ڈھاری، اتانی اور

خان صاحب سب ان کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ فنِ موسیقی کو ہندوؤں نے اپنایا۔ حالاں کہ جتنی خدمات، ایجادیں اور اضافے مسلم فن کاروں نے کیے، دوسری قوم اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اس سلسلے میں ان کے متعدد مضمین شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی شرافت ضرب المثل ہے۔ پچیس تیس سال ہو گئے ہیں لیکن آج تک کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے اور نہ آج تک کسی طوائف کو شاگرد بنایا۔ اور وہ صرف اس لیے کہ اسی چیز نے اس عظیم فن کو بدنام کر دیا ہے اور شرفا اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کا ایک شاگرد ایک مرتبہ کسی طوائف کے ہاں چلا گیا۔ کچھ آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ابھی مبتدی تھا۔ شاہد صاحب کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے۔ کہنے لگے: "اللہ تعالیٰ نے موسیقی و شراب کو اسی لیے حرام کیا ہے کہ اس میں بڑے طرف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عام آدمی کے پاس نہیں ہوتا۔ اسے ہی دیکھو (اپنے شاگرد کی طرف اشارہ کر کے) کچھ آتا جاتا نہیں ہے اور سبق دینے لگے ہیں۔" کراچی میں مسلمان، ہندو اور پارسی لڑکیاں اسی محفل میں شریک ہوتی ہیں، جس میں شاہد صاحب شریک ہوں۔ موسیقی کی وہی محفلیں کامیاب ہوتی ہیں جن کے محرک شاہد صاحب ہوں۔ اور اسی وجہ سے پاکستان میوزک اکاڈمی کے جلسے اور محفلیں کراچی میں سب سے زیادہ شان دار اور کامیاب ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب اس اکاڈمی کے بانی اور صدر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ خاص طور پر اپنے بیوی بچوں کو ضرور لے جاتے ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شاہد صاحب ابھی پڑھنے تھے۔ دلی میں کوئی گائے کی محفل تھی۔ دلی کے مشہور گویے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ بڑے اور خاندانی گویوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہد صاحب کی جب باری آئی تو وہ گانے کے لیے سامنے آئے اور "خیال" گانا چاہا۔ رمضان خاں اس پر اڑ گئے، کہنے لگے: "خیال" نہیں گاسکتے۔ میاں صاحب زادے نغزل گاؤ۔ ان کے خیال میں استادوں کی محفل میں تو مشق اور غیر خاندانی گویے کا خیال، گانا ان کی ہتک اور بے عزتی تھا۔ شاہد صاحب بے چارے اٹھ آئے۔ ذلت کا ایک احساس ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ انھوں نے اس فن کو انتہائی محنت اور کاوش سے حاصل کرنا شروع کیا۔ دن رات کا ریاض، بڑے بڑے گویوں کی

صحبت، اچھے استادوں کی نشاگردی۔ چھپے ہوئے بوہر تکھڑے اور ایسے چمکے کہ خود استادوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اور اب پچیس تیس سال بعد عید کے چاند ان کے بڑے لڑکے کی شادی تھی۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد رات کو گانا بجانا تھا۔ استاد بندو خان، رمضان خان، امراد خان، ظہوری، کبیر خان اور دوسرے نامی فن کار جمع تھے کہ ایک نوجوان لڑکا گانے کے لیے آیا اور "خیال" گانا شروع کیا۔ شاہد صاحب، جو ایک طرف کھڑے تھے، بولے، "میاں صاحب زادے، خیال مرت گاؤ۔ غزل گاؤ۔" اور اس پر اتنا اصرار بڑھا کہ وہ خیال نہ گاسکا۔ میں نے شاہد صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ پھر رمضان خان کی طرف دیکھا اور میرا ذہن ماضی کے دُھند لکوں میں کھو گیا۔

شاہد صاحب دلی کی دائی ہیں۔ دلی کی ہریات، ہر رسم و رواج، ہر عمارت، ہر پہلو، ہر شخص سے خوب واقف ہیں۔ دلی کا کبابی ہو یا یاد رچی، کبوتر باز ہو یا قلفی حلیم والا، سب کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان سے دعا سلام ہے۔ اکثر کہتے ہیں۔ "جیل صاحب، چلو بھٹی دلی کے کباب کھالیں۔ فلاں کبابی کا لڑکا آ گیا ہے۔ دلی میں یہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب تو گدھی پر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں پنکھا جھلتا تھا۔ دلی سے شاہد صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ بی، اے کرنے کے بعد داخلہ کے لیے علی گڑھ گئے۔ ابھی غازی آباد ہی پہنچے تھے کہ دلی کی یاد ستانے لگی۔ علی گڑھ پہنچے، پروفیسر ہادی سے ملے اور دوسرے دن دلی واپس آگئے اور پھر واپس نہ گئے۔ کراچی آکر دلی کے بارے میں شاہد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ مضمون دلی سے متعلق اچھوتے اور مخصوص اسلوب میں ایسی تہذیبی دستاویز ہیں جن کا لکھنا صرف شاہد صاحب ہی کا حصہ ہے۔ ان کے پاس معلومات بھی ہیں اور کوثر و نسیم میں ڈھلی ہوئی دلی کی پیاری اور ٹکسالی زبان بھی۔ ان سب مضامین کو یک جا کر دیا جائے تو خاصے کی چیز بن جائے۔ یہ سب مضامین دل چسپ، ایسے لطیف اور ایسے پیارے ہیں کہ افسانے کی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ دلی کی بپتا، چوک کی بہار، دلی کی عید، سترھویں کی سیر شائع ہو کر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ایسے ہی ان کے ترجمے ہیں۔ وہ اردو کے ایک بہترین مترجم ہیں۔ انھوں

نے سیکرڈن مشہور افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کی مشق اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ بڑی تیزی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مسودہ میں کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی۔ جو مسودہ ہوتا ہے وہی میٹنم۔ یہ خوبی مجھے بہت کم مترجموں میں نظر آتی ہے۔

ایک دن ترجمہ کر رہے تھے، میں پہنچ گیا۔ دیکھ کر مسکرائے۔ کہنے لگے۔ "مزدوری کر رہا ہوں"۔ ریڈیو بچ رہا تھا۔ پچاگانا ہو رہا تھا۔ جب تال سرکا اتار چڑھاؤ ہوتا تو ان کی آنکھ اور سر بھی اسی اتار چڑھاؤ پر ہلتے۔ میں نے کہا۔ "شاہد صاحب، موسیقی کے پس منظر میں ترجمہ ہو رہا ہے"۔ کہنے لگے۔ "نہیں بھئی پلیم ازم کی مشق کر رہا ہوں۔ ایک وقت میں دو کام"

ہنسی مذاق ان کی نطرت میں شامل ہے۔ میاں بیوی میں بڑے خوش گوار تعلقات ہیں۔ سب کی موجودگی میں بھائی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمت شکنی کرتے رہتے تھے۔ پانچ بچوں کی ماں۔ کوئی بیس سال کے بعد انھیں شوق ہوا کہ وہ بی، اے کا امتحان دیں۔ تیاری شروع کر دی۔ امتحان قریب تھا۔ میں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے انگریزی شاعروں کے متعلق کچھ پوچھنے لگیں۔ شاہد صاحب بولے۔ "جمیل صاحب! اگر یہ پاس ہو گئیں اور انھیں بی، اے کی سند مل گئی تو میں اپنی سند واپس کر دوں گا۔"

پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسندوں نے واویلا چھائی اور اپنے سے جدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دیا تو لاہور کے جلسے میں "ساقی" کے خلاف بھی قرارداد منظور ہوئی۔ "ساقی" اور ادارہ "ساقی" کو رجعت پسند قرار دیا۔ "ساقی" کو رجعت پسند قرار دینے اور بائیکاٹ کرنے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں "ساقی" اور شاہد صاحب کے توسط سے شہرت ملی تھی یا ان کی ادبی حیثیت قائم ہوئی۔ — بات کچھ بھی نہ تھی جسکرتی صاحب بے چارے جھلمکیاں، لکھتے تھے۔ اس میں کھری کھری باتیں کرتے تھے۔ وہ باتیں جو ان کے دماغ میں آتی تھیں، واضح طور پر ایمان داری کے بل بوتے پر لکھ دیتے تھے۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ انتشار اور ابر آلود فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر نکال سکیں۔

اس زرد میں ترقی پسندوں کے محدود نظریات بھی آگے۔ ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی، اور پروپیگنڈا کا ذکر بھی آیا۔ ترقی پسندوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ ساقی "مطعون ہوا سب نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ترقی پسند کس حد تک آمرانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اور وہ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز سے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ترقی پسندوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے قرارداد پاس کرنے یا کسی رسالہ کا بائیکاٹ کرنے سے رسالہ اشاعت و مقبولیت کے اعتبار سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔ شاید صاحب کہا کرتے تھے کہ ابھی کچھ دن کی بات ہے، سب ڈھنگ پر آجائیں گے۔ میں تو جب بھی ان کو چھاپنے کو تیار تھا اور اب بھی ہوں۔ ساقی کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف الجینال قسم کے مضامین اور نظریات پیش کر سکے تاکہ اس نوع سے ادب صحیح معنی میں ترقی کر سکے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایسے مضامین شائع کیے جو خود ادارے کے ایک آدمی — عسکری صاحب کے خلاف تھے۔ نہ اس پر ان کو اعتراض تھا نہ خود عسکری صاحب کو۔ انتظار حسین نے عسکری کے خلاف مضمون لکھا۔ وہ "ساقی" میں چھپا اور پسند کیا گیا۔ میں نے خود بارہا عسکری کی مخالفت "باتوں" میں کی۔ ادب ONE WAY TRAFFIC تو ہے نہیں کہ جو ایک گروہ یا جماعت پیش کرے۔ وہی صحیح ہو اور جو راستہ اس نے خیالات کی آمد و رفت کا مقرر کر دیا، اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاید صاحب کا کہنا تھا کہ ادیب کو کبھی بھی سیاسی یا جماعتی ہرکارہ نہیں بننا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترقی پسندوں کے ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں کھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور وہی راستہ اختیار کیا جس کا پرچار "ساقی" ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ ساقی کی یہ پالیسی دوسروں کو کھٹکتی ہو تو کھٹکا کرے۔ لیکن اس سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا رہا ہے اور ساقی کی اشاعت کا یہی مقصد رہا ہے جسے وہ گزشتہ پچیس سال سے حتی الوسع پورا کر رہا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور بارانِ حاشیہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تحریک کیا ہوتی ہے، اور ترقی پسندی کس چوڑیا کا نام ہے؟ شاید صاحب ہی نے سب سے پہلے دلی میں "انجمن

ترقی پسند مصنفین قائم کی تھی۔ جس کے وہ ایک زمانہ تک جنرل سیکرٹری رہے۔ ساتی نے ترقی پسند ادب کی خوب اشاعت کی۔ اُن کی کتابیں شائع کیں۔ ان کے جوصلے بڑھائے۔ اُن کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اُسے ان کی جوہر شناسی کیسے یا ادب کی خدمت کا صحیح و صحت مند جذبہ۔ کرشن چندر سے شاید صاحب کہہ رہے تھے۔ "کرشن ناول لکھوئیں شائع کروں گا۔" کرشن اُس وقت دہلی میں تھے۔ انہوں نے کہا۔ "شاید بھائی! ایک ہزار روپے دے دیجیے۔ کشمیر جا کر لکھوں گا۔" شاید صاحب نے ایک ہزار روپے دے دیے۔ کرشن چندر کشمیر چلے گئے اور وہاں کی صحت مند آب و ہوا میں ایک ناول لکھ لائے جو بعد میں "شکست" کے نام سے شائع ہوا۔ عصمت نے ساتی ہی میں لکھنا شروع کیا اور یہیں سے عصمت، عصمت بنیں۔ ساتی نے جتنے ادیبوں کو پیدا کیا اور اُبھارا، کسی دوسرے اردو رسالے کو یہ فخر حاصل نہیں ہے۔ اور یہ شاید صاحب اور "ساتی" کی وہ خدمت ہے جسے اردو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

وہ واحد شخص ہیں جو نئے اور پرانوں، سب کو جانتے ہیں۔ دہلی میں ایک دکان تھی۔ "کتب خانہ علم و ادب"۔ یہ ہمیشہ ادیبوں کی بیٹھک اور نشست گاہ رہی ہے۔ وصی اشرف اس کے مالک تھے۔ شام کو یہاں ادیبوں کا جگمگا رہتا۔ شعر و شاعری ہوتی۔ تبادلہ خیالات ہوتا، اچھی بُری باتیں ہوتیں۔ جو باہر سے دلی آتا وہ یہاں آ جاتا اور سب سے مل لیتا۔ سامنے چوک تھا۔ شام ہوتی اور میلہ لگ گیا۔ یہ جگہ دلی کے عوامی کلچر کا مرکز تھی۔ کبوتر باز، مرغ باز، کبابی، قلعی والے، حلیم والے، کباڑی، کپڑے والے، دہی بڑے اور پھلکی والے اور پنواڑی۔ کوئی چیز ایسی ہوگی جس کا سودا یہاں نہ ہوتا ہو۔ سامنے اردو بازار تھا اور یہیں یہ کتب خانہ۔ ایک دن وصی اشرف نے کہا: "شاید صاحب، اگر آپ ان لوگوں پر لکھ دیں جو کتب خانے میں آئے اور بیٹھے تو بڑی مزے دار چیز بن سکتی ہے۔" شاید صاحب نے کہا۔ "آپ قہرست بنا دیجیے، جو رہ جائیں گے میں شامل کروں گا۔" قہرست جو بنی تو تین سو سے زیادہ افراد تھے۔ شاید صاحب کے علاوہ ان ادیبوں پر دوسرا کھل کر نہیں لکھ سکتا۔ میں بھی چار سال سے سمر ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ نال پال سارتر نے بھی ایک طویل سلسلہ مضامین لکھا ہے۔ جس میں اُن تمام ادیبوں، فن کاروں، شاعروں کا ذکر کیا

ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ضمنی طور پر ادبی تحریکات، میلانات اور نظریات پر بھی بحث ہوتی چلی گئی ہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انھوں نے کچھ لکھا جو "خریطہ خیال" کے عنوان سے "ساتی" میں اور کچھ مختلف عنوانات سے "نقش" اور "ماہ نو" وغیرہ میں شائع ہوا۔ اگر وہ اس عنوان سے کچھ لکھیں تو خاصے کی چیز بن جائے۔ اس طرح سے تیس چالیس سال کے زمانہ کا احاطہ ہو سکتا ہے، اور اردو ادب کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی بھی پڑ سکتی ہے۔ ایک تو ذاتی حالات اور پھر شاید صاحب کا اسلوب — واقعی مزا آجائے — دیکھیے اللہ میاں شاید صاحب کو کب نیکی دیتا ہے۔

شاید صاحب بڑے کاہل ہیں۔ یہ چیز ان کے وجود کا ناگزیر جز بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ پابندی اوقات کا یہ عالم کہ اگر کہیں پانچ بجے جانا ہے تو وہاں سات بجے پہنچیں گے۔ یا پھر اتنی پابندی ہوگی کہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں گے۔ انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ طبیعت میں مروّت اور لحاظ حد درجہ ہے۔ کراچی آئے تو مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ قدر دانوں نے جب دیکھا تو ریڈیو میں رکھ لیا۔ بڑی قدر کی معقول مشاہرہ دیا۔ زندگی بھر نوکری کی نہیں تھی۔ نوکری کے لیے کچھ اور خوبیاں چاہئیں، وقت کی پابندی — ممکن لگانے کی غیر معمولی صلاحیت — آنا جانا — کھانا پینا — اٹھنا بیٹھنا — اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ باتیں ان میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ لوگ جو قدر دان تھے، شاکہ ہو گئے اور نوکری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک دن کہنے لگے — جمیل صاحب پاکستان میں ملازمت اور منافقت شاید ہم معنی الفاظ ہیں۔ واقعی نوکری کرنا بڑے دل گروے کا کام ہے۔ یہ کہہ کر بیڑی سلگائی اور زور زور سے کٹش لگانے لگے۔

ایک دل چسپ واقعہ اور سنیے جب پاکستان بنا اور یہ لاہور آئے تو لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور میں بیٹھے حسب معمول بیڑی پی رہے تھے۔ لاہور ریڈیو والے ان کی خاطر تواضع سے اپنی عقیدت مندی اور احترام کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمدردی، خلوص اور محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک خاتون کچھ فاصلہ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ اتنے یہ صاحب ہیں

کون؟ کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاید احمد دہلوی ہیں۔ یہ سُنتے ہی چونک پڑیں۔ غالباً دورانِ خون تیز ہو گیا تھا۔ دماغ پر استعجاب اور عقیدت کا کوندا لپکا۔ وہ پہلو بدلنے لگیں اور بے ساختہ بولیں۔ "اگر یہ پٹری نہ پیتے ہوتے تو میں ان پر ابھی عاشق ہو جاتی" کہنے لگے۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں کیو پڈ صاحب کی ستم نظریوں سے بال بال بچ گیا اور پٹری میرا (ORGAN OF DEFENCE) بن گئی۔"

شاید صاحب کو عظیم بیگ چغتائی سے اور عظیم بیگ چغتائی کو شاید صاحب سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ "نیرنگ خیال" کے عروج کا زمانہ تھا۔ اردو دان طبقے میں اُس کا طوطی بول رہا تھا۔ عظیم بیگ اُسی میں لکھتے تھے۔ جب اُن کا مشہور افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" شائع ہوا تو گھر گھر اُس کا چرچا ہوا۔ انہوں نے بھی جو کبھی افسانہ نہیں پڑھتے تھے، بڑے شوق اور اشتیاق سے اسے پڑھا۔ اس افسانے کی اشاعت سے عظیم بیگ کی شہرت ایک دم پھیل گئی۔ شاید صاحب نے ابھی "ساتی" نکالا ہی تھا۔ نیا نیا زمانہ تھا۔ مضمون نگار ملتے نہ تھے۔ حجاب امتیاز علی اور فرحت اللہ بیگ لکھنے لگے تھے۔ انہیں فکر ہوئی کہ کسی طرح عظیم بیگ کا پتا معلوم کریں۔ بہت کوشش کی، مگر پتا معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ عرصے بعد "ساتی" کی ڈاک میں ایک خط آیا۔ یہ عظیم بیگ کا خط تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس سب پرچے آتے ہیں، لیکن ساتی نہیں آتا۔ کیا آپ ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھیج سکتے ہیں؟ اس خط کے ساتھ ہی دونوں کے تعلقات اتنی تیزی سے بڑھے کہ دانت کاٹی روٹی بن گئے۔ عظیم بیگ دتی آتے تو شاید صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ شاید صاحب عظیم بیگ کے ہاں جاتے تو کئی کئی دن رہتے۔ راتوں باتیں کرتے۔ وہ افسانے لکھتے اور شاید صاحب کو دے دیتے۔ ایک ہفتہ میں تاول لکھ دیتے۔ شاید صاحب اسے شائع کرنے کے منصوبے بناتے۔ تپ دق کے مریض تھے۔ دس سال بیمار رہے اور اسی بیماری میں بہترین افسانے لکھے۔ دھول دھپا اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اور یوں ہی مر گئے۔ جب ان کے مرنے کی اطلاع شاید صاحب کو ملی تو ایسے روئے کہ اگر کوئی قریبی عزیز بھی مرنا تو نہ روتے۔ کئی روز تک سوگ مناتے

رہے۔ اب بھی بیگم چغتائی آتی رہتی ہیں اور شاید صاحبِ خلوص کے مارے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ شاید ان کو دیکھ کر غلطیم بیگ یاد آجاتے ہیں۔ دبے زخم اُبھر آتے ہیں۔ پُرانا دوست یاد آجاتا ہے۔ وہ دوست جو وقت سے پہلے مر گیا۔ جواں مرگ۔

شاید صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پلے پڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گزرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آگئے۔ ۱۹۴۷ء سے پیر الہی کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں ساقی، کا دفتر ہے۔ وضع وہی ہے جو دہلی میں تھی۔ دہلی میں سکون تھا، آسودگی تھی۔ کہ اچھی میں نہ سکون ہے نہ آسودگی۔ بڑا کنبہ ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتوں کو وضع داری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی سکا کر کماتے ہیں، کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ بسا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان۔ اگر آپ کبھی ریڈیو پاکستان سے اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی مینے، جس کا ایک یادو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو، آنکھوں پر چشمہ ہو، پٹری مُنڈ میں ہو، سر پر سیاہ یا گہرے کتھنی رنگ کی جناح کیپ ہو، ذرا دائیں طرف کو ٹھکی ہوئی، بائیں طرف سے اٹھی ہوئی اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے، چشمہ سے جھانکتی ہوئی ٹچک دائرہ آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے، چھوٹی مہری کا پاجامہ مینے، جس کے پانچے کی مہری کے ڈوڑے نکلے ہوں اور ہلکا سا کشیدہ کاری کا جال بنا ہو، نیوکلٹ کا بوتلا ہو تو سمجھ لیجیے کہ شاید احمد دہلوی ہیں۔ دل چسپ انسان، فاضل مدیر، بہترین مترجم، صاحبِ زبان، دہلی والے۔ اور جب ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی صبح کو ٹیلی فون پر ایک صاحب نے جنازے میں شرکت کے لیے ان کا پتہ پوچھا تو میں ان کو پتہ نہ بتا سکا۔

صاحبِ طرزِ ادیب

جدید نثر کی خرابی کا سبب یہ ہے کہ اس کے بیشتر لکھنے والے اپنی روایت سے ناواقف ہیں۔ وہ صرف انگریزی پڑھتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں۔ آج کی نثر کے جملوں کی ساخت میں ایک ایسی الجھا دینے والی ترتیب ملتی ہے کہ آدمی اُسے روانی سے نہیں پڑھ سکتا۔ اسی لیے عبارت میں وہ شگفتگی اور رچاوت نہیں ہے کہ پڑھنے والا پڑھے اور مزالے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُردہ لفظوں کو جملوں کی قبروں میں اتار دیا گیا ہے جہاں سے نہ وہ بولتے ہیں اور نہ حرکت کرتے ہیں۔ یہ جدید نثر کا اسلوب ہے جو آپ کو ہر رسالے، ہر اخبار اور ہر چھٹی بُری تحریر میں نظر آئے گا۔ زبان کی غلطیاں اب اس درجہ عام ہو گئی ہیں کہ اسکول اور کالج کے طلبہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ طرزِ بیان کی اہمیت پر نہ تو کالج مدرسوں میں زور دیا جاتا ہے اور نہ نثر نگار اسے قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ "خیال ہی سب کچھ ہے" یہ ان کا نعرہ ہے اور جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبان کے خیالات کو اردو میں ان لفظوں کے ذریعے ادا کر دیا جائے جو خود نثر نگار کو معلوم ہیں۔ اس "ادائیگی" کے لیے نہ کسی کوشش و کاوش کی ضرورت ہے اور نہ خود اردو زبان کے مزاج، روایات، اور ادب سے کسی واقفیت کی پھپکی سیٹھی نثر کے انبار کے انبار نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے زبان اور اس کی ساخت بھی بدل رہی ہے، اور ایسے میں اس عمل کا ہونا فطری بات ہے۔ اس بات کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن اس بدلنے کے عمل کے دوران ہی میں ہمیں پوری احتیاط کی ضرورت ہے۔ جملوں کی ساخت بدلے، نئے لہجے زبان کے خمیر میں شامل ہوں۔ نئی ترکیبیں بنیں۔ لیکن یہ ساخت یہ ترکیبیں، یہ محاورے زبان کی تہذیب کا حصہ بن کر آئیں اور یہ کام ہمارے نثر نگار

شعوری طور پر ہی کر سکتے ہیں۔ جدید نثر میں نہ تو سبک رفتاری ہے اور نہ عام طور پر اس میں کوئی خوشبو آتی ہے۔ الفاظ سخت پتھروں کی طرح صفحوں پر پکھڑے پڑے ہیں۔ آپ جدید نثر کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ وہ "سنگفتہ" ہے۔ آپ کے پاس خیال بذاتِ خود کیسا ہی کیوں نہ ہو، اگر ادائیگی کے سانچے مضبوط نہیں ہیں، اگر الفاظ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے، اگر آپ کو اس زبان کے محاوروں کے استعمال پر پوری قدرت نہیں ہے تو خیال کی قوت لفظوں کا لباس پہنتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ آپ کا احساس ادھورا، آپ کا جذبہ نامکمل اور آپ کی بات بے اثر رہ جائے گی۔ اگر ادیب کی بات بے اثر ہو جائے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ پورے طور پر ادا نہ کر سکے تو اس کا خیال بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ بات کو بااثر طریقہ پر کہنے کی کوشش ہی میں ادیب لفظوں کو پوری احتیاط سے برتا ہے۔ وہ اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ پر ادا کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے محنت کرنا ہوتی ہے اور ذرا سی بات کہنے کے لیے اسے بہت سا وقت لگانا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر لفظوں کی پری شینٹ میں اترتی ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت مصروف رہتے تھے، کوئی کالم لکھنا ہوتا تو چلتے پھرتے لکھ لیتے۔ اسی لیے وہ بات جو ایک کالم میں زیادہ موثر طریقے سے کہی جاسکتی تھی، چار چار پانچ پانچ کالموں میں ادا ہوتی۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ ہاں بھئی یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن مختصر لکھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ بات کہہ کر انہوں نے اپنی کمزوری کا اعتراف تو ضرور کیا لیکن ساتھ ساتھ اسلوبِ بیان اور انشا پر داری کا ایک اہم نکتہ بھی بیان کر دیا۔ لفظوں کی فضول نثرچی اور ان کا بے جا استعمال نثر نگار کا سب سے بڑا جرم ہے۔ کم سے کم اور موزون ترین الفاظ میں بات ادا کی جائے، اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب لکھنے والا زبان کے مزاج سے آگاہ، اس کی روایت، لفظوں کے صحیح معنی، اور محاوروں کے صحیح استعمال سے واقف ہو۔ جو لفظ یا محاورہ آئے وہ سچے موتی کی طرح روشنی دے۔ جیسے ایک اعلیٰ جنرل لاکھوں کی فوج کو سمجھ داری کے ساتھ اتحاد اور نظم و ضبط کے رشتے میں پروئے رہتا ہے اور جس کے ایک حکم پر ساری فوج کھڑی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اچھا نثر نگار بھی لاکھوں لفظوں کی فوج کا جنرل ہے، جو یہ جانتا ہے کہ کس لفظ کو کب اور کیسے استعمال کیا جائے۔ مختلف الفاظ اور محاوروں کی کیا روایت اور تاریخ ہے۔ ان کے اندر نئے معنی اور خیال و احساس کے بدلتے دھاروں کو کیسے داخل کیا جاسکتا ہے۔ اگر نثر نگار لفظوں کو برتنے کا سلیقہ نہیں رکھتا، اگر وہ لفظوں کے مزاج و معانی سے واقف نہیں ہے تو وہ اس طالب علم کی طرح ہو کر رہ جائے گا جس نے امتحان کے پرچے میں 'پوچھنا' کے محاورے کو یوں استعمال کیا تھا کہ "ہائے افسوس سلمیٰ کی پوچھٹ گئی۔"

یہاں اتنی لمبی تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے تاکہ میں یہ کہہ سکوں کہ ایسے دور میں جہاں نثر کا یہ حال ہو، وہاں شاہد احمد دہلوی کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تمہکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کر سکے جس کے میٹھے مہلوں کا ذائقہ ایک طرف اس کی بھوک مٹا سکے اور دوسری طرف اس کے چٹخاروں سے روحانی کیف بھی حاصل کر سکے۔ میں شاہد صاحب کی تحریروں کو اسی ذائقہ اور چٹخارہ کے لیے پڑھتا ہوں تاکہ جدید نثر کے صحرائے اعظم کی طیش اور جھلسا دینے والی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لیے عاقبت پاسکوں۔ ان کی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے، وہ خوشبو جو جدید نثر میں مہبت کم محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نثر کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ شگفتہ ہے۔ پڑھنے والا اسے مزے لے لے کر پڑتا ہے اور بات پورے طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ ان کی نثر سب سے الگ ہے۔ اسے تاش کے پتوں کی طرح مختلف نثر پاروں کے ساتھ مچھانٹ دیجیے وہ خود ہی بکھار اُٹھے گی "میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں"۔ آپ ان کے وہ خاکے پڑھ جائیے جو انھوں نے خواجہ حسن نظامی، بیخود دہلوی، عنایت اللہ دہلوی، عظیم بیگ چغتائی، ناصر علی، میراجی اور منٹو پر لکھے ہیں۔ ان کے وہ مضامین پڑھ جائیے جو انھوں نے دہلی کی عید، چوک کی مہار، دہلی کی برسات وغیرہ کے عنوان سے لکھے ہیں یا پھر ان کے ترجمے پڑھ جائیے جو انھوں نے 'مغرب کے شاہکار' افسانوں اور ڈراموں کے کیے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ زبان و بیان پر قدرت رکھنے والا نثر نگار اپنی زبان کی روایت اور مزاج سے رشتہ نانا برقرار رکھ کر بھی کیا کیا کام انجام دے سکتا ہے۔ ان کی نثر کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آدمی کو اپنی بات کس طرح کہنی چاہیے کہ

شگفتگی بھی یاتی رہے اور بات بھی پوری ادا ہو جائے۔ شاہد صاحب کی نثر میں وہ دل کشتی اور شگفتگی ہے کہ بات دل میں اُتر جاتی ہے۔ اُن کی عبارت میں نہ تو انگریزی الفاظ آتے ہیں اور نہ فارسی عربی کے الفاظ نثر میں شان و شوکت اور گھن گرج کا اضافہ کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ محاوروں اور لفظوں کا اس قدر صحیح استعمال ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ جو آپ سے بات کرتا ہے، آپ کو ٹھیکتا بھی ہے، اور جھنجھوڑتا بھی ہے اور انہیں الفاظ کے ذریعے خیال و احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔

”دلی کی بیٹا“ ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی۔ اس میں لکھنے والے پر جو کچھ بیٹا پڑی، جو کچھ واقعات اس نے اپنی آنکھ سے دیکھے اُن کو من و عن بیان کر دیا۔ ویسے تو بہت سے نامور ادیبوں نے بھی فسادات کے بارے میں افسانے، ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے لیکن جو چیز آج بھی اُسے دل چسپ بنائے ہوئے ہے وہ اس کا انداز بیان ہے۔ اس کی خوب صورت نثر ہے۔ اس کی نکسالی اور با محاورہ زبان ہے جس کی سادگی میں وہ مہمہ دار بیان ہیں کہ آدمی اس سے ہر بار ایک نئی لذت حاصل کرے۔ میں یہ بات صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ فسادات کے سلسلے میں جو چیزیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بیشتر کو اگر آج پڑھا جائے تو پڑھنا دو مہر ہو جائے۔ ”دلی کی بیٹا“ آج بھی اسی طرح دل کش اور دل چسپ ہے۔ ”دلی کی بیٹا“ سے اور کچھ نہیں تو اس بات کا تو پتا چلتا ہے کہ اچھی نثر وقت کی تلوار کی تیز دھار سے فن پارہ کو کس طرح محفوظ کر لیتی ہے۔ انداز بیان ہی وہ چیز ہے جو کسی تحریر کو ہمیشہ نیا رکھتا ہے۔ ”اب حیات“ تاریخی اعتبار سے کتنی ہی غلط سہی لیکن آج بھی یہ کتاب اسی طرح تروتازہ اور زندہ ہے اور اس کے پڑھنے میں آج بھی لطف آتا ہے۔ ”دلی کی بیٹا“ کی نثر آج بھی اسی طرح لطف دیتی ہے اور آج بھی دل پر اسی طرح اثر کرتی ہے۔

دوسرے اور فنون کی طرح نثر کا بھی یہ کمال ہے کہ آدمی جو کچھ محسوس کرے اور جو کچھ خیال کے زور سے دیکھے اُسے اسی شدت اور جامعیت کے ساتھ لفظوں کی گرفت میں لے آئے تاکہ جیب پڑھتے والا اُسے پڑھے تو اس کے اندر بھی وہی شدت احساس، جذبہ اور تصویر خیال پیدا ہو جائے جو لکھنے والا پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس اعتبار سے بھی شاہد احمد دہلوی کی نثر نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں میں ایک مثال سے اپنی بات واضح کروں گا:

” ریل چلتی اور رکتی رہی اور سب بیٹھے بیٹھے اور نگھنے اور سونے لگے۔
 میں بھی کھڑکی سے سر یا ہنر کالے اوتنگھ رہا تھا۔ دو بج رہے تھے اور لدھیانہ
 آنے والا تھا۔ گاڑی خوب تیز چل رہی تھی کہ ایک دم جھٹکا کھا کر رُک گئی۔
 ساری گاڑی میں ایک شور برپا ہو گیا جھٹکوں سے جا نہیں سی گھل گئیں۔“
 (دلی کی پستنا)

بات سیدھی سادی ہے۔ نہ اس میں افسانویت ہے اور نہ مبالغہ کے ذریعہ کسی
 قسم کی شدت دکھائی گئی ہے، لیکن ریل کے ڈبے اور مسافروں کی اس حالت کو جو ایک دم
 جھٹکا کھا کر رُکنے سے ڈبے اور مسافروں کی ہوٹی، نثر نگار نے ”جا نہیں سی گھل گئیں“ کے
 مختصر سے جملہ سے ادا کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والے کے سامنے ایک دم جھٹکا کھا کر گاڑی
 رُکنے کی حالت کی مکمل تصویر آجاتی ہے۔ شاہد صاحب کی نثر کی یہ وہ خوبی ہے جو ان کے ہاں
 اثر آفرینی کا یاد و جگا دیتی ہے۔

زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ ان کا خاندانی وصف ہے جو اپنی
 پوری رچاوت اور ایک نئے توازن کے ساتھ ان کی نثر میں آگیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی
 نثر میں ”دلی اسکول“ کا وہ سارا بانگین موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد
 حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے۔ آزاد کی نثر میں استعاروں کا استعمال کثرت سے ہوتا
 ہے۔ وہ ایک بات کو کئی کئی استعاروں کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ ان کی عبارت
 رنگین اور نخیل کے زور سے شوخ و شگفتہ ہوتی ہے۔ نذیر احمد محاوروں کو کثرت سے
 استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر صاف، طرز بیان روان، بے ساختہ اور واضح ہے۔ شاہد
 احمد دہلوی کے ہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں
 نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے ہاں نظر آتی ہے۔ اور نہ وہ طرافت جو نذیر احمد کے ہاں ملتی
 ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر کے امکانات جس نقطہ پر ملتے ہیں وہاں سے
 شاہد احمد دہلوی کی نثر پیدا ہوتی ہے، جس میں استعارے، محاورے، روزمرہ اور کسالی
 زبان ایک خاص توازن کے ساتھ ان کے مزاج کی سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لہجے

کو جنم دیتی ہے۔ اسی لیے ان کی نثر میں محاوروں کا استعمال موضوع کی مناسبت کے ساتھ خود بخود ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ ایسے ٹھاٹ یاٹ اور ٹھٹے سے جماؤ کے ساتھ آتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے محاورہ یا لفظ سے نہیں بدلا جاسکتا۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے، جس میں شگفتگی اور بانگین ایک ایسی سنجیدگی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں کہ ان کی نثر میں خوبصورت نوازن بھی ہے اور خوش انداز سنجیدگی بھی۔ نہ وہ بہت دور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ، لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لیے دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکب تیار کرتے ہیں اور یہی وہ امکان ہے جو انہیں صاحب طرز ادیب کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ میں اپنی اس بات کو ایک اقتباس سے واضح کرتا چلوں تو شاید زیادہ مناسب ہوگا :

اللہ بخشے میر ناصر علی دلی کے ان وضع دار شرفا میں سے تھے جن پر دلی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ "بزرگ" میں نے انہیں اس لیے کہا ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، انہیں بزرگ ہی دیکھا۔ سوکھ کر چرخ ہو گئے تھے۔ خستخاستی ڈارھی پہلے تل چاولی مٹی، پھر سفید ہو گئی مٹی۔ کتری ہوئی لیں، پوپلا مٹھ، دہانہ پھیلا ہوا، بے قرار آنکھیں، ماتھا کھلا ہوا، بلکہ گڈی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی میں سرو قد ہوں گے۔ بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار جھوم کر چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ، ٹخنوں تک لمبا کرتا۔ گرمیوں میں موٹی مہل یا گاڑھے کا اور جاڑوں میں فلائین یا واٹل کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں۔ جیبیں میر صاحب کہتے تھے "یہ میرے چار نوکر ہیں"۔ سطلے میں پٹکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے کی پتخ گول ٹوپی اور کبھی صافہ، گھر میں روٹی کا کنو پ بھی پہنتے تھے اور اس کے پائے الٹ کر کھڑے کر لیتے تھے۔ جیب چتہ پہنتے تو عمامہ سر پر ہوتا۔ اک برا پا جامہ، اندر بند میں کنبیوں کا گچھا۔ پاؤں میں نرمی کی سلیم شاہی۔ کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں

میں اڑا لیتے۔“ (گنجینہ گوہر)

میں نے یہاں ایک ایسا اقتباس پیش کیا ہے جو بیانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ نثر کے ایسے ٹکڑے آپ کو نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ہاں بھی ملیں گے لیکن اس اقتباس کو اگر آپ ان نثر پردازوں کی ایسی ہی تحریروں کے ساتھ رکھ کر پڑھیں تو آپ کو شاہد احمد دہلوی کی نثر میں ان دونوں کی گونج ضرور سنائی دے گی۔ لیکن ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوگا کہ یہ ان دونوں سے بالکل مختلف بھی ہے۔ نثر نگاری کی اس روایت کو اس طور پر برتنے کا ڈھنگ مجھے صرف شاہد احمد دہلوی کی نثر میں نظر آتا ہے۔ جس میں نذیر احمد اور آزاد موجود بھی ہیں اور نہیں بھی۔

شاہد احمد دہلوی کی نثر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ بوجھل پن پیدا کرتے ہیں اور نہ جملوں کا ڈھیلپن روانی کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سُلجھا ہوا انسان روزمرہ کی زبان میں بات چیت کر رہا ہے۔ بات چیت کے انداز میں ادبی نثر لکھنا کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اچھی نثر اور اچھی عبارت لکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر کی تین بنیادی خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ محاوروں کو ایسے بر محل طریقے سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت کھل اٹھتی ہے اور حسن و دل کشی کے ساتھ معنی و مفہوم کی صاف اُجلی تصویر ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کے لہجے میں ایسا سبھاؤ، ایسی مٹھاس اور گھلاوٹ ہے کہ بات چیت کا یہ انداز ہمارے وجود پر جاؤ کا سا اثر کرتا ہے اور ہم اس نثر کو پڑھ کر اس مسرت سے ہم کنار ہوتے ہیں جو ادب کی بنیادی صفت ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر کی یہ خصوصیات ان کی ہر تحریر میں ملتی ہیں۔ گرمی کا موسم ہم سب نے دیکھا اور اس کی شدت ہم سب نے جھیلی ہے۔ اب اس گرمی کا ذکر شاہد احمد کی زبان سے سنئیے :

”اب سے دُور دلی میں ایک سال ایسا سُوکھا پڑا کہ خلق خدا تراہ تراہ

پکار اٹھی۔ جھاستا ہوا سورج، بھلستی ہوئی زمین، درو دیوار سے آگ برس

رہی تھی۔ گرمی کے مارے یہ بُرا حال کہ پسینہ جو چوٹی سے بہا تو اڑی تک جا پہنچا۔ پھلروا سے لال کھلائے جاتے اور گلاب سے گال مڑھائے جاتے تھے۔ لوکی وہ شدت کہ زمین سے آسمان تک بھاڑ سا بھنٹا رہتا۔ بازار میں سے اچھا بچھا آدمی چلا جا رہا ہے کہ پٹ سے گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ لوکی، بچارے نے مچھٹکا بھی نہ کھایا۔ زمین کی نپنس کا یہ حال کہ مٹر کے دانے پھینکو تو مچھن کر چٹختے لگیں۔ شہر کے آس پاس تمام ندی نالے، تالاب چقر سوکھ گئے تھے۔ رات کو جس ایسا ہوتا کہ دم گھٹا جاتا پنکھا جھلنے جھلنے ہاتھ ٹوٹے جاتے۔ چار پاٹیاں ابھی مچھوٹی ہیں، ابھی دیکھو تو بان خشک پڑا ہے۔ کمرنگانا مشکل، کروٹ لینا دشوار۔ مگر دلی کے زندہ دل ایسے سسے میں بھی کب چوکتے ہیں۔ ایک صاحب لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

کیا بے سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں (ایمرا دیار)

یہ طرزِ ادا چوں کہ ان کی سب کڑیوں میں مشترک ہے اس لیے ہم شاہد احمد دہلوی کو صاحبِ طرزِ ادیب کہہ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو صاف ستمگری، آسان اور خوب صورت اردو پڑھنا، سیکھنا یا لکھنا چاہتے ہیں، شاہد احمد دہلوی کی نثر ان کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولوی عبدالحق

دامانِ دلی میں ایک قصبہ ہے ہاڑپ۔ اُس کی دو چیزیں مشہور ہیں، پاڑپ اور مولوی عبدالحق۔
 — پاڑپ ہر شہر میں بنتے ہیں مگر جو مزرہ ہاڑپ کے پاڑپ میں تھا کسی اور جگہ کے پاڑپ میں نہیں تھا۔
 عبدالحق بھی بے شمار پیدا ہوئے مگر مولوی عبدالحق کا جواب آج تک نہ ہو سکا ہے

اگرچہ شیخ نے دائرہ بڑھائی سن کی سی

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

میرے والد کے پاس اردو کے اکثر رسالے آتے تھے، انہی میں ایک رسالہ "اردو" بھی تھا جس کے ایڈیٹر عبدالحق تھے۔ میں اُس زمانے میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ فارسی اور اردو ابا مجھے خود پڑھاتے تھے۔ اس لیے عمر کے لحاظ سے اردو کی زیادہ ہی چٹیک مجھے ہو گئی تھی۔ میں کالج کی ابتدائی جماعتوں میں تھا کہ اسی رسالہ اردو میں "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" کے عنوان سے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون چھپا۔ میری چڑھتی جوانی تھی اور مزاج کی افتاد بھی جذباتی تھی۔ وہ محبت اور خلوص تو دکھائی نہیں دیا جو اس مضمون کے لفظ لفظ سے ٹپکتا تھا۔ ہاں وہ ایک بات نشرین کمر دل میں چھپ گئی جس سے مولوی نذیر احمد کی سبکی ہوتی تھی۔ چھٹیوں میں جب میں دلی گیا تو ابا پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ اور وہ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی منذر احمد سے اس مضمون کا ذکر کیا۔ وہ اُس وقت قانون پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "بھائی، اس مرزا اور مولوی پر اہانت کا مقدمہ دائر کر دو۔" بھائی سنجیدہ اور بردبار آدمی ہیں۔ بولے۔ "تم نے شاید اس مضمون کو ردِ روی میں پڑھا ہے، جزوی طور پر بعض باتیں اس میں یقیناً قابلِ اعتراض ہیں مگر پورے مضمون کے تاثر میں اُن کی شدت باقی نہیں رہتی۔ دادا ابا کے بارے میں جو باتیں انہوں نے

لکھی ہیں، بہت کچھ صحیح ہیں۔ البتہ زیب داستان کے لیے کہیں کہیں مبالغے سے بھی کام لیا ہے۔ تم اس مضمون کو دوبارہ ٹھنڈے دل سے پڑھو اور اس نظر سے پڑھو کہ یہ تمہارے دادا کی کہانی نہیں ہے، ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ہے۔ میں نے اس مضمون کو پھر پڑھا۔ واقع میں اتنا ناگوار نہیں گزرا۔ اور پھر کچھ عرصے بعد پڑھا تو مرزا فرحت اللہ بیگ سے غائبانہ انس ہو گیا۔ اور جب میں نے جنوری ۱۹۳۰ء میں ساقی "جاری کیا تو مرزا صاحب سے خط و کتابت بھی شروع ہو گئی اور وہ "ساقی" کے لیے مضامین بھی بھیجتے لگے۔ یوں فرحت اللہ بیگ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب کو میں نے پہلی بار جانا پہچانا۔

۱۹۳۰ء کے بعد میں کئی دفعہ حیدرآباد گیا مگر مولوی صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکا۔ مولوی صاحب اور نگ آباد میں رہتے تھے اور انجمن کا دفتر بھی وہیں تھا۔ ایک بات پر مجھے بڑا اچنبھا ہوتا تھا کہ غیر ملکی (غیر حیدرآبادی) ہوتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق اتنی طویل مدت تک حیدرآباد میں کیسے جھے رہے؟ ان کے پیش رو محسن الملک وقار الملک، مولوی نذیر احمد اور مولوی صاحب کے ہم عصر مولوی ظفر علی خاں اور مولانا عبدالمآجد دریا بادی، اور خبر نہیں کون کون اس ریاست میں اپنے قدم نہیں جما سکے اور کتنے ہی بڑے آدمیوں کو خارج المیلد کیا گیا۔ مگر مولوی صاحب تھے کہ ڈٹے ہوئے تھے، اور ترقی کرتے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اپنی مدافعت میں وہی ہتھیار استعمال کیے ہیں جو ملکی لوگ حملہ کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے حیدرآباد کے تمام بڑے لوگوں کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اور وزیر اعظم حیدری کے توناک کے بال بن گئے تھے۔ مگر مولوی صاحب صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتے رہے، انہوں نے ریاست کے بڑے بڑے کام بھی کیے۔ انجمن ترقی اردو کو اتنا فروغ دیا کہ انجمن سارے ہندوستان کے لیے اردو کا مرکز بن گئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا منصوبہ مولوی صاحب ہی نے بنایا تھا۔ جب یہ اردو یونیورسٹی بنی تو اس کے لیے دارالترجمہ قائم کیا جس میں اعلیٰ قابلیت کے مترجم جمع کیے۔ اس دارالترجمہ نے تمام علوم و فنون کو اردو میں منتقل کر دیا۔ اور یہ مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے دنیا کو دکھایا کہ

اُردو بھی کامیاب ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم مولوی صاحب ہی تھے۔ جب اُن کی دوسری مصروفیات بڑھیں تو منشی ذکا اللہ دہلوی کے صاحب زادے مولوی عنایت اللہ دہلوی کو مولوی صاحب نے اپنا جانشین مقرر کیا۔ مولوی صاحب کی طرح یہ صاحب بھی علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹ تھے۔ مولوی صاحب کی طرح انھوں نے بھی سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں اور کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ترجمہ بہت عمدہ کرتے تھے۔ اتنا عمدہ کہ ایک خط میں سرسید نے منشی ذکا اللہ کو لکھا کہ "مخفار اللہ کا تم سے اچھا ترجمہ کرتا ہے"۔

مولوی عبدالحق صاحب نے شادی ساری عمر نہیں کی۔ یہ بھی سنا تھا کہ ایک دفعہ گھردالوں نے گونڈگانہ کے ان کی شادی کر دی تھی تو مولوی صاحب نے حیدرآباد واپس پہنچ کر طلاق نامہ بھیج دیا تھا۔ اصل میں اُن کی شادی تو اُردو سے ہو چکی تھی اور اُردو سے انھیں اتنی محبت تھی کہ وہ اُس پر سوکن لانا نہیں چاہتے تھے۔ ساری عمر اُردو ہی کی خدمت میں گزار دی۔ اگر وہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں میں الجھ جاتے تو آج اُردو کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو اُسے حاصل ہے۔ اُردو سے اُن کے شدید عشق کا اظہار اُس وقت ہوا جب گاندھی جی نے ہندوستانی کا انتقال چھوڑا۔ جب گاندھی جی سے مولوی صاحب نے ہندوستانی کی وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا۔ "ہندی انھوں ہندوستانی"۔ یعنی وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی بن جائے گی۔ مولوی صاحب نے گاندھی جی کو بتایا کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہونڈبان یولی اور سمجھی جاتی ہے، وہ اُردو ہے۔ اور یہی زبان ہندوستانی ہے۔ مگر گاندھی جی ہندی سا ہتھیا سمیلن کے بھڑے میں آئے ہوئے تھے۔ یولے۔ "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے بڑھائیں اور زندہ رکھیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کی زبان سے جب ہٹ دھرمی کی یہ باتیں مولوی صاحب نے سُنیں تو مولوی صاحب کو بھی حصارہ آگیا۔ گاندھی جی کو خوب آڑے ہاتھوں لینے کے بعد بتایا کہ اُردو نہ تو مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی زبانیں تو عربی اور فارسی ہیں۔ قرآن خط نسخ میں لکھا جاتا ہے، اُردو نستعلیق

ہیں۔ مگر گاندھی جی بھی ڈسٹانی سے اپنی بات پر جیسے رہے اور ہندی امھوا ہندوستانی کی رٹ لگاتے رہے۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد پہنچ کر ایک طویل بیان شائع کر کے تمام اخباروں اور رسالوں کو بھیج دیا۔ اس بیان نے سارے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ بات تمھی سچھی، بہت سے ہندوؤں نے بھی ساتھ دیا اور گاندھی جی کی تھڑی تھڑی ہوتے لگی۔ مگر بڑے آدمیوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اور گاندھی جی کو تو ان کی قوم تے مہاتسا بنا رکھا تھا، پھر لالوں کے لال ہو گئے۔ دھوئی بیٹا چاند سا، سیٹی پٹاخ۔

جب گاندھی جی اردو کی جان کے لاگو ہو گئے۔ اور ہندوستانی کی آڑ میں ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے پر تُل گئے تو مولوی صاحب نے انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مولوی صاحب دلی آئے اور دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کر اب پر لے لی۔ اس وقت دریا گنج میں سب سے بڑی کوٹھی ڈاکٹر انصاری ہی کی تھی۔ یہ بڑی تاریخی کوٹھی تھی۔ جب تک ڈاکٹر انصاری زندہ رہے اس کوٹھی میں کانگریس کے تمام بڑے لیڈر جمع ہو کر مشورے کرتے رہے۔ اسی کوٹھی کو مولوی صاحب نے اردو کا گڑھ بنایا اور انجمن کا دفتر اس میں منتقل کر دیا۔ دلی والوں نے مولوی صاحب کا شان دار استقبال کیا اور ایک جلوس کی شکل میں انجمن اسٹیشن سے کوٹھی تک لائے یہ جگہ بھی انجمن کے دفتر کے لیے عارضی تھی۔ مولوی صاحب نے نئی دہلی میں ایک پرسکون مقام پر بہت وسیع زمین کے لیے درخواست دے دی تھی۔ بعد میں یہ زمین انجمن مل گئی تھی۔ اس پر انجمن کی ایک شان دار عمارت بنوانے کا ارادہ تھا مگر انجمن کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ عمارت بنو الیٰتی۔ مولوی صاحب نے اس کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا اور ۱۹۴۷ء کی غارت گری شروع ہو گئی۔

یہ منصوبہ یوں اور بھی پورا نہ ہو سکا کہ سر اکبر حیدری جب تک حیدرآباد کے وزیر اعظم رہے انجمن کو ریاست کی طرف سے سالانہ امداد ملتی رہی۔ سر اکبر حیدری کے بعد نواب چغتاری وزیر اعظم بنے۔ ان کے عہد میں بھی ریاستی امداد بے سچون و چہرہ جاری رہی۔ مگر جب سر مرزا اسماعیل برسر اقتدار آئے تو انھوں نے انجمن کی امداد روک دی۔ یہ صاحب تھے تو مسلمان مگر انگریزوں اور ہندوؤں کے پٹھو تھے۔ پھر مولوی صاحب کے دلی منتقل ہوتے

ہی دکن کے چند مقامی بااثر لوگوں نے انجمن کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی اور اپنی ایک ڈیڑھ اینٹ کی انجمن بنا کر ملکی اور غیر ملکی آگ کو بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ سر مرزا نے مخالف گروہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی انجمن کی امداد بند کر دی تھی۔ مولوی صاحب آسانی سے شکست مان لینے والے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے فوراً ایک کانفرنس بلوائی اور سر مرزا کی اس حرکت کو متفقہ طور پر غلط قرار دیا گیا۔ اس کے ایک اجلاس میں میں بھی شریک ہوا تھا اور مولوی صاحب نے اسی اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ "میں اپنا کل اثاثہ انجمن کی نذر کرتا ہوں" اس وقت معلوم ہوا تھا کہ یہ اثاثہ پانچ لاکھ کا تھا۔

مولوی صاحب نے ایک کل ہند کانفرنس علی گڑھ میں بھی کی تھی جس میں سر راس مسعود بھی شریک ہوئے تھے۔ میں نے راس مسعود کو پہلی اور آخری بار اسی کانفرنس میں دیکھا تھا۔ بڑے قد اور دیوبیکل آدمی تھے۔ مگر بھدے بھونڈے نہیں لگتے تھے۔ ذہانت ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ اور وجاہت ان کی پیشوائی کرتی تھی۔ ایک اجلاس ختم ہوا تو مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ہال میں سے باہر آئے۔ مولوی صاحب میانہ قد کے آدمی تھے۔ مگر راس مسعود کے پہلو میں بونے نظر آ رہے تھے۔ مولوی صاحب ان سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے کوئی اپنے سے بہت چھوٹے سے باتیں کرتا ہے۔ یہی مولوی صاحب تو تھے جنہوں نے دیکھا تھا کہ سر سید اپنے پوتے راس مسعود کو مہلا کر سلانے کے لیے لوری دے رہے تھے اور اس منظر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے باہر بھاگ گئے تھے۔

اُردو، ہندی اور ہندوستانی کی بحث کسی طرح طے نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ گاندھی جی جیسے ہما تھا دھرم نکل کر کہتے لگے تھے کہ میں جو زبان بولتا ہوں، وہی ہندوستانی ہے۔ مولوی صاحب نے ان کے جواب میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں جو زبان بولتا ہوں یہی ہندوستانی ہے۔ رہی ہندی، تو ہندی کے اتنے الفاظ نہیں ہیں جتنے کہ اُردو میں۔ آخر میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہندوستانی اس زبان کو موسوم کیا جائے جو عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط، دونوں میں لکھی جائے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ پنڈت جو اہر لال مہر و جب تقریر کرتے تھے تو فصیح و بلیغ اُردو میں، اور اچانک جب انھیں خیال آ جاتا تھا تو ایک آدھ

لفظ ہندی کا بھی بول جاتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو پر جب تقریر نشر کرتے تھے تو ان کا مسودہ اردو میں لکھا ہوا ہوتا تھا۔ رہے گاندھی جی، تو انہیں نہ تو ہندی آتی تھی اور نہ اردو۔ ایک دفعہ "تیج" اخبار کے ایڈیٹر نے ان سے اپنے اخبار کی کسی خاص اشاعت کے لیے مضمون مانگا تو گاندھی جی نے اردو میں انہیں خط لکھا: "بھائی دلش بندھو۔ جانو کہ میں سوکھ گیا ہوں"۔ اس خط کا عکس اخبار میں شائع کیا گیا تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ روشنائی میں سے مکوڑا نکال کر کسی نے کاغذ پر پھینک دیا ہے۔

گاندھی جی سے ٹکر لینے کے بعد مولوی صاحب اردو کے قائد اعظم بن گئے تھے اور بابائے اردو کہلانے لگے تھے۔ یہ صرف مولوی صاحب ہی تھے جو اردو کے لیے لڑتے پھرتے تھے۔ اور اردو کے پروپیگنڈے کے لیے کسی سے ایک پیسہ طلب نہیں کرتے تھے۔ ان کے پیڑھیت سر سید احمد خاں سارے ملک میں گھوم پھر کر چندے اکٹھا کرتے تھے۔ مگر مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ کسی سے چندہ مانگتے مجھے شرم آتی ہے۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ چنانچہ سارے اعتراضات مولوی صاحب اپنی پنشن سے پورے کرتے تھے۔ مولوی صاحب خاصے کھڑے آدمی تھے۔ وہ کسی سے ملنے جلنے کے قائل نہیں تھے۔ جب وہ دلی آکر رہ پڑے تو انہوں نے کسی سے خود جا کر ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر کوئی شخص غائبانہ عقیدت کے باعث ان سے ملنے چلا جاتا تو خوش واپس نہ آتا۔ اول تو مولوی صاحب تک اس کی رسائی نہ ہوتی اور یاہر ہی باہر یہ کہہ کر اُسے ٹال دیا جاتا کہ مولوی صاحب کچھ ضروری کام کر رہے ہیں، اس وقت نہیں مل سکتے۔ یا عقیدت مند شخص اس پایہ کا ہوتا کہ اُسے ٹالنا نہ جاسکتا ہو تو مولوی صاحب اُس سے مجبوراً مل لیتے۔ مگر اس رکھائی سے کہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرتے۔ لہذا ملاقات دو چار ہی منٹ میں ختم ہو جاتی۔ اگر اُسے کوئی معاملے کی بات کرنی ہوتی تو اُسے کیفی صاحب اور ہاشمی فرید آبادی صاحب کے پاس بھیج کر اپنا پیچھا چھڑا لیتے۔ اس عادت کی وجہ سے مولوی صاحب بد مزاج اور مغرور سمجھنے جانے لگے تھے۔ مولوی صاحب کا ہی آدمی تھے، ملنے جلنے سے ان کے کام میں حرج ہوتا تھا۔ اگر وہ رکاوٹ نہ ڈالتے تو ملنے جلنے ہی کے ہو کر رہ جاتے۔ مولوی صاحب دلی آکر خاصے پُرانے ہو گئے تھے مگر میں ان سے

ملنے نہیں گیا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ میں ان کے کھڑے پن کی کہانیاں سن چکا تھا۔ اسی اثنا میں
 ایک دن مولوی صاحب کا پیغام پہنچا کہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ جو صاحب یہ پیغام
 لائے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ ”آج کیا جاتی دنیا مولوی صاحب نے دیکھی کہ یاد فرمایا؟“ انہوں
 نے ہنس کر بتایا کہ مسٹر فضل احمد کریم فضلی آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب سے
 کہا کہ شاید صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، انہیں بلوایئے۔ ”فضلی صاحب سے میرا ربط قائم
 ہو چکا تھا، اور وہ ”ساتی“ کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں ضرور
 آؤں گا۔“ وقت مقررہ پر میں انجمن کے دفتر پہنچا۔ صحن میں کرسیاں دائرے کی شکل میں
 لگی ہوئی تھیں۔ پندرہ سولہ حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو کسی نے پذیرائی نہیں
 کی۔ میں خاموشی سے کیفیت صاحب کے پاس ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کیفیت صاحب سے میری
 یاد اللہ تھی، ان سے گاہے گاہے بات کرتا رہا۔ سامنے مولوی صاحب اور فضلی صاحب
 بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ان دونوں میں سے ایک بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے فضلی صاحب
 کو یوں پہچان لیا کہ ان کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ قاعدہ ہے کہ میزبان اپنے ہمالوں کا خیر مقدم کرتا
 ہے اور ہر مہمان کا تعارف بھی کرتا ہے۔ مگر یہاں یہ کچھ نہیں تھا۔ طبیعت کو یہ کس مہربانی
 اکھری۔ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں اور فضلی صاحب کا کلام سنایا گیا۔ اس کے
 بعد اطلاع آئی کہ کھانا لگ گیا ہے۔ مولوی صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے: ”چلیے کھانا تیار
 ہے۔“ یہاں اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کی طرف چلنے لگے۔ میں نے باہر کا رخ کیا اور مولوی
 صاحب کی نظر بچا کر کھسکنے کا ارادہ کیا۔ ادھر کیفیت صاحب کھٹکے اور ادھر مولوی صاحب
 نے بھی تاڑ لیا۔ کیفیت صاحب نے پوچھا۔ ”ادھر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ادھر چلیے۔“ میں نے کہا۔
 ”جب مولوی صاحب مجھے جانتے ہی نہیں تو مجھے بلانا کیا ضرور تھا؟“ اتنے ہی میں مولوی صاحب
 بھی آہٹ پیچھے کیفیت صاحب نے کہا۔ ”یہ شاید احمد صاحب ہیں، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے۔“
 مولوی صاحب نے مسکرا کر میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور بولے۔ ”آئیے۔“ اور اسی طرح
 مجھے کمرے میں لے جا کر فضلی صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا اور بولے۔ ”لیجیے، یہ ہیں آپ
 کے شاہد صاحب۔“ فضلی صاحب بڑی گرم جوشی سے گلے ملے اور بولے: ”آپ تو کافی

دیو کے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا۔ "جی ہاں، مگر آپ تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔" بات آئی گئی ہو گئی اور سربے ہنسی نوشی کھانا کھایا۔ فضلی صاحب نے میرے گھر کا پتا پوچھا اور دو ایک دن بعد مجھ سے ملنے تشریف لائے اور مجھے اپنا اور بھی گرویدہ کر گئے۔ مولوی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، مگر نہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے ان سے۔ اس کے بعد بھی بیسیوں دفعہ ان سے آتا سامنا ہوا مگر جم کر گفتگو ان سے کبھی نہیں ہوئی۔ میرا نام تک ان کو یاد نہیں رہتا تھا۔ کسی سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا آیا ہے یا نہیں۔

مولوی صاحب بڑے نفیس مزاج آدمی تھے، عمدہ اور قیمتی کپڑا پہنتے تھے۔ تشریف دانی، تدریسی ٹوپی اور ایک بڑا پاجامہ۔ ساری عمر ان کا یہی لباس رہا۔ سوٹ پہنے ہوئے نہ تو کبھی انہیں دیکھا اور نہ کوئی تصویر ہی ایسی دیکھی جس میں سوٹ پہنے ہوں۔ کھانا اچھا کھاتے تھے۔ اور ایک ہی وقت میں کئی قسم کا ہوتا تھا۔ پھل بھی ضرور ہوتے تھے۔ ان کے مقربین میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ بمبئی میں کسی رئیس نے مولوی صاحب کی دعوت کی۔ میزبان کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کھانے کے بعد موسم کا پھل ضرور کھاتے ہیں۔ لہذا کھانا ختم ہو جانے کے بعد میزبان نے آواز لگائی۔ "فروٹ لاؤ۔" تو ملازمین نے ڈشوں میں گنڈیریاں لاکر رکھ دیں۔ مولوی صاحب متبسم ہوئے مگر اپنے میزبان کا دل رکھنے کے لیے ایک آدھ گنڈیری لے لی۔ وہاں سے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب اپنے ساتھیوں سے پوچھتے رہے اور ہنستے رہے کہ "کہو تم نے کتنے فٹ پھل کھایا؟ اور تم نے کے گز پھل نوش جاں فرمایا؟"

مولوی صاحب کھانے کے وقت کھانے کے تمام آداب کا خیال رکھتے تھے، لقمہ مہبت بڑا نہ ہو، کھانے میں چمچر چمچر کی آواز نہ ہو۔ سنے ہوئے ہاتھ سے پانی نہ پیتے، زیادہ عجلت سے نہ کھاتے، زور سے ڈکار نہ لیتے وغیرہ۔ ایک بھلے آدمی کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے لگے۔ مولوی صاحب نے استکراہ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ اور جب وہ اپنی انگلیاں چاٹ چکے تو اپنا ہاتھ بھی ان کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولے۔ "بِسْمِ اللّٰهِ" اس پر سرب ہنس پڑے اور اس غریب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک اور صاحب تھے جنہیں مولوی صاحب نے چائے پر بلایا تھا۔ چائے

آئی تو اُس کے ساتھ کچھ فینسی بسکٹ بھی تھے۔ اُن صاحب نے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا۔ مولوی صاحب ایک دم سے لائول پڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ مہمان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے ناراضگی سے کہا۔ ”لندن میں تین سال تک تم جھک مارتے رہے، یہ بسکٹ چائے میں ڈبو کر کھانے کے ہیں؟“ یہ کہہ کر الگ جا بیٹھے اور چائے کو پھر ہاتھ نہ لگایا۔ مجھے جب بھی مولوی صاحب کے عصر انوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تو میں اُن سے دُور بیٹھتا تھا اور ہمیشہ مجھے یہ دونوں واقعات یاد آ جاتے تھے۔

حیدرآباد میں مولوی صاحب بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے، صرف ایک آدمی اُن کے ساتھ بطور میرانتظام رہتا تھا۔ اتنی بڑی ڈھنڈار کوٹھی میں مولوی صاحب اکیلے ہی رہتے تھے۔ مگر کھانا عموماً اکیلے نہیں کھاتے تھے۔ دو چار دوست شام کی چائے اور رات کے کھانے پر ضرور بلائے جاتے تھے۔ اور یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن سے مولوی صاحب کھل کر باتیں اور مذاق کر سکتے تھے۔ یوں تو مولوی صاحب بہت لیے دیے رہتے تھے۔ کم بولتے تھے اور کوئی بات ہنسی کی نہیں کرتے تھے۔ مگر سنا ہے کہ نجی صحبتوں میں اپنے بے تکلف دوستوں سے خوب ہنستے بولتے تھے۔

پطرس نے ایک دفعہ بتایا کہ مولوی صاحب جب کھل جاتے تو غضب کے زندہ دل ہو جاتے تھے اور ”پھکڑ لڑنے میں تو مولوی صاحب کا جواب ہی نہیں ہے“ کہاں تک گھٹے گھٹے رہتے؟ وہ بھی تو آخر انسان ہی تھے۔ سر اکبر حیدری تو مولوی صاحب کو چھیڑتے تھے اور جب مولوی صاحب انہیں جوتیوں پر دھریتے تو خوب ہنستے۔ ذاتا تریہ کیفی سے بھی مولوی صاحب کے درینہ تعلقات تھے۔ کیفی صاحب مولوی صاحب سے کوئی آٹھ دس سال بڑے تھے مگر دونوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی جگہ نکلی تو مولوی صاحب نے کیفی کو اس جگہ پر لانے کی کوشش کی مگر ملیکیوں نے اخباروں اور پوسٹروں کے ذریعے قیامت برپا کر دی اور کیفی صاحب کا تقرر اس جگہ پر نہیں ہو سکا۔ لہذا مولوی صاحب جب تک حیدرآباد میں رہے اردو کے پروفیسر بھی رہے۔ جب مولوی صاحب وئی آگے تو کیفی صاحب ان کے رفیق کار ہو گئے اور انجمن کے دفتر ہی میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب اکثر دُوروں پر رہتے تھے۔ اور کیفی صاحب ہی انجمن کے تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے ایک اور پُرانے

دوست اور رفیق کار ہاشمی سرمد آبادی صاحب تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے آئے تھے اور یہاں انجمن کا دفتر قائم کر کے کام کرنے لگے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے آشوب میں انجمن بھی دھڑی دھڑی کر کے لٹی۔ وہ تو خدانے بڑی خیر کی کہ مولوی صاحب اس وقت دلی میں رہتے تھے۔ ورنہ وہ ہرگز انجمن کو نہ چھوڑتے، اور انجمن کے چوکیدار اور اس کے بیوی بچوں کی طرح مولوی صاحب بھی قتل کر دیئے جاتے۔ کیفی صاحب کراچی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد دلی واپس چلے گئے تھے تاکہ انجمن کو وہاں سنبھال لیں۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا؟ لاکھوں روپوں کی کتابیں اور تباہ لائبریری کے پورے سارے دریا گنج میں اڑتے پھرتے تھے۔ بہر حال انجمن ترقی اردو برائے نام کیفی صاحب کے دم کے ساتھ قائم رہی۔ کیفی صاحب کی عمر نوے سے اوپر ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے، بصارت زائل ہو رہی تھی، مگر اردو کے لیے موت کو ٹالتے رہے۔ جب لال قلعہ کے دربارِ خاص میں جشنِ عام ہوا تو پنڈت جی کو تختِ شاہی پر بٹھایا گیا تو کیفی صاحب نے وہیں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور ناراض ہو کر چلے آئے۔ زندگی کے باقی دن انھوں نے بڑی سکلیف میں بسر کیے۔ ایک دفعہ انھیں ان کی سالگرہ پر عقیدت مندوں نے ایک بڑی رقم کی تھیلی پیش کی تو انھوں نے وہ سارا روپیہ انجمن کو دے دیا۔ پنڈت کیفی نے ۹۶ سال کی عمر پائی۔ اور آخر دم تک اردو کے لیے لڑتے رہے۔ مولوی صاحب کو پھیرنے کے لیے کیفی صاحب کہا کرتے تھے: "مسلمان کبھی اچھی اردو لکھ ہی نہیں سکتا۔"

مولوی صاحب کو پاکستان آنے کے بعد چین نصیب نہیں ہوا۔ یہاں عجیب افراتفری مچی۔ جلد جلد حکومتیں بدل رہی تھیں۔ سب کو اپنی اپنی لگی ہوئی تھی، اردو کو بھلا کون پوچھتا؟ اردو کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک چل رہی تھی کہ اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کی قومی زبان اردو نہیں ہونی چاہیے۔ اس نازک وقت میں اگر اہل پنجاب یہ کہہ کر سامنے نہ آجاتے کہ ہماری زبان اردو ہے تو آج اردو صرف مہاجرین کی زبان بن کر رہ جاتی۔ ادھر قائدِ اعظم نے اعلان کر دیا کہ "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔" اس وقت تو محافلین کا دفتر گیا مگر قائدِ اعظم پاکستان بننے کے ایک سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور اردو کا معاملہ پھر کٹائی میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ محمد علی بوگرہ وزیرِ اعظم بن گئے اور انھوں نے اپنی خیر منانی

کے لیے دو قومی زبانوں کی تجویز پیش کی۔ اور تو کسی میں ہمت کیا تھی کہ حکومت سے ٹکرائے۔
 مولوی صاحب ہی برسہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کی لکار پر لاکھوں فدائی
 اُن کے گرد جمع ہو گئے اور جس دن اسمبلی کے اجلاس میں ہو گا اکی تجویز پیش ہونے والی
 تھی، مولوی صاحب اس ضعیفی اور کمزوری کے عالم میں انجمن کے دفتر سے پیدل
 روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ لاکھوں کا مجمع تھا۔ اسمبلی پہنچے تو ہمارے حکام اور قانون ساز
 مولوی صاحب اور ان کے ساتھ اتنا بڑا مجمع دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ پولیس کے دستے
 لاکھیاں لیے کھڑے تھے، اشک اور گیس کا بھی انتظام تھا، اور گولی چلانے والے دستوں
 کا بھی۔ مجمع اس قدر مشتعل تھا کہ اگر پولیس ذرا بھی حرکت میں آتی تو نذر پٹج جانا اور یہ آگ
 کراچی سے پھیل کر سارے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ ہو گا اُنے بڑی دانش مندی
 سے کام لیا کہ خود آ کر مولوی صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے اور مولوی صاحب سے
 وعدہ کیا کہ قومی زبان کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا جائے گا۔ مولوی صاحب کو ناچار وہاں سے
 ٹوٹنا پڑا۔ مگر وہ حکومت کے ہتھ کنڈوں سے خوب واقف تھے، نامطمئن واپس آئے
 اور جب جذبات میں سہیان نہ رہا تو اعلان کر دیا گیا کہ پاکستان کی قومی زبانیں دو ہوں گی۔
 اردو اور ہنگالی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بہت کچھ کہا سنا۔ مگر نقار خانے
 میں طوطی کی آواز کون سناتا ہے۔

مولوی صاحب نے جب انجمن کو جمایا تو اسی عمارت کے ایک حصے میں اردو
 کالج بھی کھول دیا۔ اس کالج میں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جانے لگے۔ مولوی صاحب
 نے اس کالج کو وزارتِ تعلیم سے تسلیم کر لیا۔ اور یہ بات منظور کر لی گئی کہ امتحان کے پرچوں
 کے جوابات اردو میں دیے جاسکتے ہیں۔ اس کالج کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ اردو کو اگر
 ذریعہ تعلیم بنالیا جائے تو انگریزی ذریعہ تعلیم سے بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ کالج کے
 کامیاب تجربے کے بعد مولوی صاحب کو اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی لگن لگ گئی تھی۔
 کراچی کا اگر ایک سرمایہ دار بھی ہمت کر جاتا تو یونیورسٹی بن جاتی۔ مگر ہمارے سرمایہ دار بھی
 حکومت کا رخ دیکھ کر چلتے ہیں۔ حکومت اس تبدیلی کے خلاف تھی لہذا مولوی صاحب

کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

اسی اثناء میں یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی صحت خراب رہنے لگی۔ جب مولوی صاحب نے نئے انتظام کے تحت انجمن کے کارکنوں کے اختیارات میں تبدیلی کی تو بعض پُرانے کارکن انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ نئے کارکنوں نے مولوی صاحب کو تو خوش رکھا مگر اندر ہی اندر انجمن کو مٹا کر شروع کر دیا۔ مولوی صاحب میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جب کسی پر اعتماد کر لیتے تھے تو پھر چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، ان کا فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی طویل زندگی میں بار بار اس نوع کے اعتماد سے نقصان اٹھایا تھا مگر ان کی یہ کمزوری آخر وقت تک قائم رہی۔ جب انجمن کے انتظامی بورڈ نے دیکھا کہ انجمن کھٹکھٹ ہوئی جا رہی ہے اور مولوی صاحب کھٹکھٹ کرنے والوں کو، مردّت میں بے گناہ سمجھے جا رہے ہیں، تو انہوں نے باہمی مشورہ کر کے انجمن کو اور انجمن کے کتب خانہ کو سیل کر دیا۔ اس کارروائی سے مولوی صاحب کو سخت اذیت پہنچی اور انہوں نے ایک کتابچہ "انجمن کا المیہ" شائع کیا۔ یہ انجمن کے عروج و زوال کی ایک دردناک کہانی تھی جس میں مولوی صاحب نے انتظامی بورڈ کے ممبروں کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اُس وقت انجمن کو سیل نہ کر دیا جاتا تو جو کچھ پچ رہا تھا وہ بھی خالص لگ جاتا۔ مولوی صاحب کے معتمد کو مولوی صاحب کے پاس آتے جانے سے روک دیا گیا تھا تو مولوی صاحب اس مظلوم کے گھر خود جانے لگے تھے! اعتماد ہو تو ایسا ہو۔

یہ زمانہ مولوی صاحب کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے اپنے پُرانے رفقاء کے کار کو ناراض کر کے چلتا کر دیا تھا۔ اور نئے معتمد کے پیچھے اپنی ساکھ بھی گاڑ لی تھی، ان کے ہمدردوں کو شبہ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب کا دماغی توازن جاتا رہا ہے اور ایک صاحب نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مولوی صاحب کو ریٹائر ہو جانا چاہیے کیوں کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر مولوی صاحب اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے اور مستعفی نہیں ہوئے۔ جب مارشل لاء نافذ ہوا اور صدر ایوب برسرِ اقتدار آئے تو مولوی صاحب نے ان سے اپیل کی۔

صدر ایوب نے تمام باتوں کو نظر انداز کر کے انجمن اور لائبریری کو مولوی صاحب کے حوالے کر دینے کا حکم دے دیا تھا اس سے سوکھے دھانوں میں پانی پڑگا اور مولوی صاحب کی اندھیری زندگی میں دوبارہ روشنی آگئی۔

مولوی صاحب انجمن کے اتنے شدید عاشق تھے کہ انہوں نے کسی اور کو انجمن کے معاملات میں دخل دینے نہیں دیا۔ انہیں شاید یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کوئی اور انجمن پر قابض ہو کر انہیں بے دخل نہ کر دے۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے سامنے ہی انجمن اور اردو کا کام کرنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر جاتے جو ان کے بعد دائرۃ المعارف اعظم گڑھ کی طرح بہت مفید علمی کام بھی کرتی رہتی اور شبلی کی طرح مولوی صاحب کے بھی بیسیوں نام لیوا اس وقت موجود ہوتے۔ انجمن کی موجودگی ہی میں ترقی اردو بورڈ کا قائم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انجمن ناکارہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے ۲۵-۳۰ سال پہلے اردو کی ایک بہت بڑی اور جامع لغت کا منصوبہ بنایا تھا اور حکومت حیدرآباد نے اس کام کے لیے کئی ہزار روپے سالانہ کی امداد بھی دینی شروع کر دی تھی۔ اس لغت کا سارا کام مولوی صاحب نے مولوی احتشام الدین حقّی دہلوی کو سونپ دیا تھا۔ یہ صاحب اٹھارہ گھنٹے روزانہ لغت کا کام کرتے تھے، اور اس محنت و جان فشانی سے کہ پورا ترقی اردو بورڈ مع اپنے وسیع وسائل کے نہیں کر رہا۔ حقّی صاحب کو مولوی صاحب پانچ سو روپے ماہانہ دیتے تھے۔ مگر حقّی صاحب پیسے کے لیے کام نہیں کرتے تھے، کام کے لیے کام کرتے تھے۔ اور جب وہ کام میں مہنگے ہوتے تھے تو انہیں دین دنیا کی خیرنگ نہیں رہتی تھی۔ ان کی بیگم بار بار دروازے کے قریب آ کر کہتی تھیں "کھانا کھالیجیے۔" اور حقّی صاحب "اچھا" کہتے اور قبول جاتے۔ یہ ناشائیں نے حیدرآباد میں بھی دیکھا اور دلی میں بھی۔ دلی میں جب انجمن کی امداد کم ہوئی تو مولوی صاحب نے حقّی صاحب کے پانچ سو کے بدلے ڈھائی سو روپے کر دیے تھے مگر حقّی صاحب کے کام کرنے کے انداز میں فرق نہ آیا۔ اب ان کا بڑھاپا بھی آگیا تھا اور صحت خراب رہنے لگی تھی مگر وہ دُھن کے پکے تھے اور جب تک جاگتے رہتے تھے، کام کیے جاتے تھے۔ اور جب انجمن کی امداد بند ہو گئی تو مولوی صاحب نے حقّی صاحب سے کہہ دیا کہ کام بند کر دو تمہیں تنخواہ نہیں ملے گی۔ مگر حقّی صاحب عمر مہر کی اس عادت

کو کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ اور اب تو صرف آنکھوں کی سُوئیاں رہ گئی تھیں۔ لہذا بے تنخواہ ہی کام کرتے رہے۔ ادھر وہ اپنا کام ختم کر رہے تھے ادھر ان کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ بُخت کے آخری حصے کی نظر ثانی کر رہے تھے کہ اعصابی نظام نے جواب دے دیا۔ چند روز ہسپتال میں رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے صاحب زادے شان الحق حقی نے تمام مسودات مولوی صاحب کے حوالے کر دیے تھے۔ پھر خبر نہیں وہ مسودات کہاں گئے۔

آن دفتر اگاؤ خورد و گاوڑا اقباب بُرد

مولوی صاحب بہت باقاعدہ عادتوں کے مالک تھے۔ صبح کی چہل قدمی سے رات کی مٹی تک اُن کا روزانہ ایک ہی سا پروگرام ہوتا تھا۔ راتوں کو جاگتے نہیں تھے۔ نیند پوری لیتے تھے اور صبح تازہ دم اُٹھتے تھے۔ نوٹے سے اوپر ہو گئے تھے مگر صحت اچھی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ سو پار کر جائیں گے۔ مگر ابھی سو میں پانچ چھ سال باقی تھے کہ بیمار رہنے لگے۔ مرض صحیح تشخیص نہیں ہوتا تھا۔ خیال تھا کہ ہاضمہ کی شکایت ہوگی۔ جو کراچی میں عام ہے۔ مگر جب مرض بڑھنا گیا تو ہسپتال میں داخل ہو گئے، افاقہ نہیں ہوا۔

صدر ایوب کو مولوی صاحب کی علالت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے پنڈی بلوا کر سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہاں مولوی صاحب کا مرض کینسر تشخیص ہوا۔ علاج مرض کا علاج ہی کیا؟ جب زندگی سے مایوسی ہو گئی تو مولوی صاحب کو کراچی کے نیول ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ یہاں پہنچے تو مرض اتنا بڑھ چکا تھا کہ مولوی صاحب اکثر بے ہوش رہنے لگے۔ جب انھیں ہوش آتا تھا تو کچھ بولنا چاہتے تھے مگر لقاہت اتنی تھی کہ سرگوشی سُنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف دو لفظ کبھی کبھی قریب رہنے والوں نے سُنے:

مولانا عبد السلام نیازی

مولانا اپنی وضع قطع سے ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ یس نے انھیں اب سے چالیس سال پہلے قاضی کے حوض پر ایک گندھی کی دکان پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ گندھی صاحب بھی کچھ اس گت کے آدمی تھے کہ جو بھی ادھر سے گزرتا اس کی نظر خواہ مخواہ ان پر پڑتی تھی۔ لچیم شمیم گونڈت کا ایک کالا پہاڑ دکان کے تھڑے پر دھرا دکھائی دیتا تھا۔ رنگ سیاہ، سر خوب گھٹا ہوا، کالی گول داڑھی، سفید سفید آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے تمباکو کے پنڈے میں کوڑیاں جھڑی ہوئی ہوں۔ کرتا پاجامہ اجلا براق پہنتے تھے۔ یوں ان کا لارنگ اور بھی چمک اٹھتا تھا۔ سامنے تیل کے کنٹر چنے رہتے تھے۔ مولانا کا رنگ میدہ و شہاب تھا۔ سر گھٹا ہوا، اس پر چینی ہوئی دوپٹی، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، جگر جگر کرتی آنکھیں، کنار اسی ناک، موزوں دہن، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کی سُرنی جو پھیل کر باجھوں میں آگئی تھی، داڑھی موچھ صاف، جیسے مجدد اکرادیا ہو، گلے میں باریک مثل کا کرتا۔ آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سیم شاہی، کندھے پر شالی رومال وضع قلندرانہ، مزاج شایانہ۔ اس وقت جوانی سے گزر کر ادھیڑ عمر میں قدم رکھ چکے تھے۔ حوض قاضی کی دکان پر گندھی صاحب کے پہلو پہلو بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔

ایک صاحب نے رات کا اندھیرا مٹھ پر مثل رکھا تھا، دوسرے صاحب نے دن کا اجالا عجب اجتماعِ ضدین تھا۔ یوں اور بھی نظریں ان کی طرف کھینچتی تھیں۔ دنوں نہیں، برسوں یہ دن رات کا تماشا ہم دیکھا کیے۔

مولانا کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ بہت سنیں، تو انھیں دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اور ایک دن سترھویں میں انھیں خواجہ حسن نظامی کے پکھوے سے لگے دیکھا تو یس نے اپنے ساتھی سے پوچھا

کہ "یہ کون صاحب ہیں؟" انھوں نے ہیرت سے میری طرف دیکھا۔ بولے۔ "آپ انھیں نہیں جانتے؟" میں نے کہا۔ "دیکھا تو اکثر ہے مگر...." وہ بولے "ارے صاحب! یہ مولانا عبدالسلام صاحب نیازی ہیں۔" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، اور میں نے جو بے شمار روایتیں ان کے بارے میں سنی تھیں، سب میرے تختل میں ہجوم کر آئیں۔

اس واقعے کے بعد کوئی پچیس سال تک میں مولانا کو دیکھتا رہا، اور کبھی کبھی ان کی مختصر گفتگو سننے کا مجھے اتفاق ہوا۔ مگر مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے کبھی ان سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرے لیے وہ ہمیشہ دُور کا جلوہ ہی رہے۔ میں پاکستان چلا آیا تو وہ آنکھوں سے بھی دُور ہو گئے۔ اور اب تو وہ بہت دُور ہو گئے۔ اتنی دُور کہ اب آنکھیں انھیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

مولانا نے ساری دنیا کا علم چاٹ رکھا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے منہتی تھے۔ مذہبی علم، معقول و منقول، دونوں ان کے پاس اتنا تھا کہ سوائے مولوی ایوب کے کوئی اور ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ بہر علم سے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ علم موسیقی سے بھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ ہر کتاب انھیں از بر تھی۔ یہاں تک کہ بعض کتابوں کے صفحے تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر دیکھو، یہ عبارت ملے گی۔ مزاج میں درشتی بہت تھی، اس لیے اپنی شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے۔ مگر جس کو انھوں نے پڑھا دیا وہ پارس بن گیا۔ شاگرد سے ناراض ہوتے تھے تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے۔ مثلاً اسے ستون سے باندھ دیتے اور زیادہ غصہ آتا تو اسے بید سے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ علم کا ایک سمندر تھا کہ ان کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ چاہتے تھے کہ شاگرد بھی انھی جیسا ہو جائے۔ جب یہ توقع پوری نہ ہوتی تو جھنجھلا تے اور شاگرد کی شامت آجاتی۔

مولانا کی گفتگو بڑی نستعلیق ہوتی تھی۔ کبھی علمی لہر آجاتی تو ادق استعاروں میں بولنے لگتے۔ مثلاً ایک دفعہ زبانی کے متعلق فرمایا کہ "اس منڈت لحمی کو تو عمودِ زبریں چاہیے۔" اور کبھی نکسالی لہر آجاتی تو سہل منتح پیرایہ بیان اختیار کرتے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی کافرانہ باتیں سن کر فرمایا کہ "تمھارا دماغ تو شیطان کی کھڑی ہے۔" کبھی درگاہ کا گانا سننے تو اس کے کانے کی تعریف

بھی کرتے اور اس کی انگلیوں کی بھی۔ فرماتے تھے کہ تمہاری انگلیاں کیا ہیں ہری سرچیں ہیں۔ نظام وکن میر عثمان علی خاں ایک زمانے میں دُنیا کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی تھے۔ مولانا کے ایک بہی خواہ نے مولانا سے کہا کہ ”آپ اگر نظام کو ایک درخواست لکھ دیں تو آپ کا وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔“ مولانا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ غصے سے بولے۔ ”نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو میرا بال ہی بھاری اترے گا۔“

مولانا کا بظاہر کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ معلمی کا وہ کچھ مہنہ لیتے تھے۔ لوگوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ مولانا تیل بنا کر بیچتے ہیں۔ ننوا تیلی سے ان کا دوستانہ ہے۔ اُس کے لڑکے کو بھی مولانا نے پڑھایا تھا۔ قاضی کے حوض پر جس گندھی کی دکان تھی، اُس سے بھی ان کا دوستانہ تھا۔ بس یہی دو تیلی تھے جس سے مولانا خرید فروخت کرتے تھے۔ مگر یہ مہنہ معلوم ہو سکا کہ کیسا تیل خرید لے تھے، کتنا خریدتے تھے، اُسے بناتے کس طرح تھے، کس وقت بناتے تھے اور کب بیچتے تھے مولانا کے خرچ بڑے اچھے تھے اور ان کا ہاتھ بھی کھلا ہوا تھا۔ تیل سے ایسی کیا یافت ہو جاتی ہوگی؟ ہم تو کہتے تھے ”میاں تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔“ ایک صاحب کہتے تھے کہ مولانا کو تیل کا نسخہ ایک موکل نے بنایا تھا، اس لیے ان کا تیل نوب پکتا تھا، کیوں کہ کسی اور کو تو یہ تیل بنانا آتا نہیں تھا۔ وٹی والوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا کو دستِ عزیز ہے۔ ان کی جیبوں میں ہر وقت نوٹ بھرے رہتے تھے۔

مولانا کو گانا سننے کا شوق تھا۔ لغتیں اور غزلیں سننے تھے۔ سوئی والوں میں گلے بجانے والوں کا ایک خاندان شاہی زمانے سے رہتا تھا۔ اسی خاندان کا ایک لڑکا، جس کی مہیں بھیگ رہی تھیں، کسی عرس میں مولانا کی نظر پڑ گیا۔ مولانا حُسن پرست بھی تھے حُسنِ مجازی میں اُنھیں حُسنِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ کیوں نہ ہو، صوفیِ مصافی تھے۔ ہر اچھی شکل میں جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ عثمان کا شمار حسینوں میں نہیں تھا۔ ہاں سانولا سلونا لڑکا تھا۔ مولانا نے اُسے اپنے کمرے میں بلانا شروع کر دیا۔ اس سے دو چار چیزیں سننے اور پانچ روپے دے کر رخصت کر دیتے۔ عثمان کے ساتھ اُس کا جوڑی دار رمضان بھی جایا کرتا تھا۔ اس کا رنگ کھلا ہوا تھا، عمر میں عثمان سے ایک آدھ سال بڑا تھا۔ اُسے پکے گانے کا شوق تھا مگر غزل گانے میں عثمان کو سہارا

دینار رہتا تھا۔ مولانا نے اس جوڑی کو اپنے ڈھب سے خوب سدھایا تھا۔ انھیں فارسی اور اردو کا منصوفانہ اور عاشقانہ کلام یاد کرا دیا تھا۔ مولانا ان دونوں کو اپنے کمرے میں بھی سُنتے اور اپنے ساتھ دتی اور دوسرے شہروں کے عرسوں میں بھی لے جاتے۔ جب یہ دونوں گاتے تو مولانا کے ساتھ محفل بھی جھوم جاتی۔ ادھر مولانا نے دو چار روپے دیے ادھر روپے کا مینہ برس جاتا۔ دونوں لڑکے چھولیاں بھر بھر کر گھر لاتے۔ حاسدوں نے مولانا کے متعلق طرح طرح کی ہواٹیاں اڑانی شروع کر دیں۔ شدہ شدہ یہ باتیں عثمان کے گھر والوں تک بھی پہنچیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور آپس میں مشورے ہوئے کہ اس بدنامی سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کسی نے کہا عثمان کو مولانا کے ہاں جانے سے روک دیا جائے۔ مگر اس صورت میں جو موٹی آہنی ہو رہی تھی، وہ بھی ماری جاتی۔ زبانِ خلق نے خاندان والوں کو مولانا کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ ”بھٹ پڑے وہ سوتا جس سے ٹوٹیں کان۔ آبرو ہے تو سب کچھ ہے“ لہذا عثمان کو روک لیا گیا۔ مولانا کے ہاں سے طبعی ہوتی تو اڑان گھاٹیاں بتا دی جاتیں۔ جب مولانا کی طرف سے اصرار پڑھا تو خاندان کے دو چار بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مولانا کی تیوری پریل پڑ گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ ”دُنیا کچھ ہی کہا کرے، پریشتم قلندر۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ عثمان کا بدن میرے لیے ایسا ہے جیسے میری ماں کا بدن۔ عثمان کے بڑے بوڑھوں کا اطمینان ہو گیا اور عثمان کا آنا جانا پھر کھل گیا۔

مولانا قوالی بھی سُنتے تھے اور ان پر کیف بھی طاری ہوتا تھا، مگر حال کھیلنے یا دوسرے صوفیوں کی طرح رقص کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جو شعر پسند آجاتا تھا اس کی تکرار کرتے تھے۔ خوب جھومتے تھے اور قوالوں کو روپیہ بھی خوب دیتے تھے۔ خسرو کی نعت ”منی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم“ بہت پسند تھی۔ مقطع کی تکرار ضرور کرتے تھے۔

عرسوں میں زندگیوں کا گانا بھی سُنتے تھے اور لطف اندوز ہو کر روپیہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی شدتِ کیف میں طوائف میں انھیں جلوہ دکھائی دے جاتا تو طوائف کو پاس بلا کے اُس کا بڑے بڑے لبتے۔ یہ گویا مولانا کی طرف سے انتہائی قدر دانی ہوتی تھی۔ طوائفیں بھی اس عمل کو اپنے

لیے یا عرشِ فخر سمجھتیں۔

مولانا بڑے خوش مزاج اور فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ایک عرس میں بہت سارے مشائخ اور صوفی جمع تھے کہ ایک حسین طوائف اپنا گانا سنانے آ بیٹھی۔ ایک صوفی صاحب نے اسے دیکھ کر "جل جلالہ" کا نعرہ لگایا۔ اتنے ہی میں اس کی ناکھ مٹی آدھمکی۔ مولانا نے صوفی صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا، "یہیجیے "عثمانوالہ" بھی تشریف لے آئی ہیں۔ ایک فقہیہ پڑا اور سوسو پڑ گھڑوں پانی پڑ گیا۔

دیواری میں مولانا ایک گانے کی مٹل میں شریک ہوئے۔ ایک پڑھی لکھی طوائف گارہی تھی۔ مولانا نے اس سے فرمائش کی کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ اشعار کی جو غزل یاد ہو، سناؤ۔ اُس نے کہا۔ "حضور، غزل تو نہیں، ہاں ایک خمسہ یاد ہے" فرمایا۔ "سناؤ۔" اس نے چالیس بند کا ایک خمسہ سنایا۔ جب اس نے گانا ختم کیا تو مولانا نے تعریف کی اور فرمایا۔ "جو چیز مجھے پسند آجاتی ہے میرے حلقے میں محفوظ ہو جاتی ہے" یہ کہہ کر پورا خمسہ اُسی ترتیب سے سنا دیا۔

اب سے چالیس سال پہلے دلی میں ایک لال بیگی تھا۔ نام اُس کا صنم تھا۔ اُس کی دو لڑکیاں تھیں جنہیں اُس نے گانے بجانے پر لگادیا تھا۔ مگر یہ دونوں بہنیں کہلاتی "بھنگنیں" ہی تھیں۔ صورتِ شکل کی بھی بُری نہیں تھیں۔ سفید دوپٹہ، سفید کرتا اور سفید ڈھیلا پاجامہ۔ شریف بہو بیٹیوں کی سی وضع قطع۔ ایک بہن ڈھولک بجاتی تھی، دوسری ہار موندیم۔ اور دونوں مل کر گاتی تھیں۔ تان فاف درست۔ کلام اچھا یاد تھا۔ بھمبری آوازیں۔ سماں بانڈھ دیتی تھیں۔ خود شائستہ تھیں اس لیے محفل بھی شائستہ ہوتی تھی۔ مولانا ان کا گانا بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ایک دن رات کے دو بجے خدا جانے مولانا کو کیوں یاد آگئیں۔ اُسی وقت حکیم علی رضا خاں کے گھر پہنچے۔ انہیں جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آئے۔ "خیر تو ہے مولانا؟" بولے۔ "انہیں بلواؤ۔ ان کا گانا سنیں گے"۔ بھلا مولانا کا کہنا ٹل سکتا تھا۔ اُسی وقت آدمی گیا اور انہیں بلوا لایا۔ حکیم صاحب کی بیٹھک میں گھنٹہ دو گھنٹے گانا سنا اور انہیں کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

اُسی زمانے میں جاوہر کا بخشو تو ال دلی میں آیا اور خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید شیخ یعقوب ٹیپیکہ کے ہاں رہنے لگا تھا۔ بخشا چھریے بدن کا نازک سا نوجوان تھا۔ اچکن اور آٹے

باجائے میں بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی انوٹ سے بول بنانا تھا۔ اور لے کی تراش خراش اچھی کرتا تھا۔ اس کا گتیا جھمن خاں بھی عین عین اسی کا منشا تھا۔ ڈھولک بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بخشا جب پہلی مرتبہ سترھویں میں خواجہ صاحب کی محفلِ خاص میں گیا تو ساری دلی میں اُس کی شہرت ہو گئی۔ مولانا بخشا پر فدا ہو گئے تھے اور ادا کر اس کی قوالی سننے تھے۔ بخشا بھی بڑی عقیدت سے انہیں اپنا گانا سنانا تھا۔ جب اور جہاں یاد فرماتے، فوراً حاضر ہو جاتا۔ افسوس کہ بخشا جوان ہی مر گیا۔ جھمن خاں اب بھی زندہ ہیں مگر بخشا کے بعد سے زندہ درگور۔

ایک محفلِ خاص میں مولانا نے عثمان خاں کو گانے بٹھا دیا اور ایک فارسی نغزل کی فرمائش کر دی۔ مولانا اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک صوفی نے کسی شعر کو غلط بنا دیا۔ مولانا کو تاؤ آ گیا۔ بولے۔ "ہنیں، صبح گارہا ہے۔" خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے صوفی کی طرف داری کی۔ مولانا بھڑک اُٹھے۔ بولے۔ "شیخ، اگر کچھ سمجھتے ہو تو اس کی تشریح کرو۔" سب خاموش رہے تو مولانا کا بوالا مکئی مچھتا اور دو گھنٹے تک عالمِ لاہوت اور ناسوت کا لاوا بہتا رہا۔

مولانا کی طلاقِ لسانی اور خوش بیانی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ رُوح کی ماہیت پر جو صبح سے بولنا شروع کیا تو سارا دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی۔ صبح چار بجے تک لکیر جاری رہا، اور ناتما رہا۔

مولانا کی آمدنی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کوئی ذریعہ اُس کا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے پاس حاجت مند بھی آتے تھے اور کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔ حاجت مند کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک دفعہ چار آدمی اجیر شریف کے عرس سے لوٹ رہے تھے کہ ان کا سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ مولانا سے ملنے گئے تو مولانا نے اپنے ایک شاگرد کو آواز دی کہ دیکھو۔ چھینکے پر کچھ نوٹ رکھے ہیں، وہ اتار لاؤ۔" دو سو کے نوٹ تھے جو انھوں نے ان حضرات کو پیش کر دیے۔

حیدرآباد دکن سے ایک نواب صاحب دلی آئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا؟" نواب صاحب نے کہا۔ "سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

مولانا کو جلال آگیا۔ فرمایا۔ "کیوں بلایا ہے اُس نے ہمیں؟ اگر وہ اپنے علم سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کے رعب میں آنے والے نہیں۔ اور اگر وہ ہمیں اپنی دولت دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ارے عثمان! دیکھو، وہ سامنے مچان پر جو بوری رکھی ہے، اٹھا لاؤ۔" عثمان جا کر بوری اٹھالایا۔ مولانا نے فرمایا۔ "اس میں جو کچھ ہے، باہر نکال۔" عثمان نے بوری میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو نوٹوں کی گڈمی نکلی عثمان نے وہ گڈمی فرش پر رکھ دی۔ مولانا نے ڈپٹ کر کہا۔ "اور نکال، عثمان نے پھر ہاتھ ڈالا اور ایک گڈمی نکال کر رکھ دی۔ غرض یوں ہی سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکالتا رہا اور گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مولانا نے نواب صاحب سے کہا۔ "اور دیکھیے گا؟" نواب صاحب تھرا گئے۔ بہکلا کر بولے۔ "غصہ کے پاس کیا کمی ہے؟" مولانا نے فرمایا۔ "جا، اپنے نظام سے کہہ دے، ہم کسی کے پاس نہیں جایا کرتے۔" نواب صاحب ہاتھ جوڑتے اور سلام جھکاتے وہاں سے رخصت ہوئے۔ مولانا نے عثمان سے کہا۔ "انہیں بوری میں بھر کے وہیں رکھ آ۔" عثمان نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹیں اور بوری پھر مچان پر رکھ دی۔ رمضان کے دل میں بدی آئی۔ عثمان سے کہا۔ "ایسے دو ایک گڈیاں تو پار کر دے۔" عثمان نے سنس کر کہا۔ "بوری میں کیا رکھا ہے؟ بوری تو خالی ہے۔" اُسناد رمضان خاں زندہ سلامت ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنا یہ چشم دید واقعہ سنایا۔

مولانا کو ایک زمانے میں شعر و شاعری کا بھی شوق ہوا تھا۔ داغ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اُسناد سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب کسی سے اُسناد کا شعر سننے تو "سبحان اللہ" کہہ کر فوراً سجدہ کر لیتے۔

سجدہ کرنے پر یاد آیا کہ مولانا کا عالم شباب تھا کہ دلی کے ایک معروف حکیم کی داشتہ دھنوں پر مولانا عاشق ہو گئے۔ چرخے والوں میں پہلا کمرہ جگمگی طوائف کا تھا، اور دوسرا دھنوں کا۔ مولانا کا عشق دینا زمانے سے نرالا تھا۔ روزانہ رات کو ایک مقررہ وقت پر دھنوں کے بالا خانے پر جاتے۔ دروازہ تھپتھپاتے۔ دھنوں دروازہ کھولتی تو اس کے ہاتھوں میں تسلی ہوئی اگر تکیوں کا مٹھا ہوتا۔ وہ دھونی دیتی، مولانا آستانِ محبوب پر سجدے کرتے اور چلے جاتے۔ اُن کا یہ معمول غصہ دراز تک رہا۔ ع خدا رحمت کندہ این عاشقانِ پاک طینت را

مولانا ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کرتے تھے۔ دلی کے ایک بہت نامور عالم دین گزرے ہیں مولوی کرامت اللہ۔ بڑے پابندِ شرع اور نیک بزرگ تھے۔ ان کے بے شمار مرید بھی تھے۔ ایک دفعہ اپنے وعظ میں انہوں نے ڈاڑھی کی فضیلت بیان کی اور ڈاڑھی نہ رکھنے کی فیضیت۔ مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو برامان گئے۔ ایک دن ساری رات توالی سننے کے بعد صبح ہوتے گھر آ رہے تھے کہ راستے میں کرامت اللہ صاحب کا گھر ٹپ گیا۔ مولانا مع اپنے حواریوں کے وہیں رُک گئے۔ کندی بجائی، مولوی صاحب خود برآمد ہوئے۔ مولانا کو ناوقت دیکھ کر حیران ہوئے مگر فوراً تعظیماً مصافحہ کیا اور فرمایا۔ "بِسْمِ اللّٰہِ، اندر تشریف لائیے۔" اپنے کمرے میں لے جا کر عزت سے بٹھایا پوچھا۔ "کیسے قدم رنجہ فرمایا؟" مولانا نے کہا۔ "شیخ! ہم نے سوچا آج تم سے ڈاڑھی پر گفتگو ہو ہی جائے۔" اور اس کے بعد مولانا کے علم کے سمندر میں جوار مچھانا آ گیا۔ خدا جانے مولوی صاحب نے مولانا کو کیسے رام کیا کہ آخر میں سندھی خوشی رخصت ہوئے۔

عجیب ہے کہ مولانا نے کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی اور نہ کسی کو اپنے پیچھے پڑھنے دی۔ ایک دفعہ صاحب صاحب کے ہاں حاضرین نے انہیں زبردستی گونہ گونہ کے نماز پڑھانے کھڑا کر ہی دیا۔ خبر نہیں مولانا کے جی میں کیا آئی کہ رضا مند ہو گئے۔ پہلی رکعت میں جرب سجدے میں گئے تو سب کو چھوڑ کر چلتے بنے۔

مولانا نقد دم تھے۔ ان کا کوئی عزیز اقارب کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ بس جو کچھ تھا ننوا تیل تھا۔ یا اس کے بچے۔ ترکمان دروازے تیلیوں کے پھانک کے سامنے مولانا کا بالا خانہ تھا، جس میں وہ اکیسے رہتے تھے۔ ننوا تیلی کے بڑے بیٹے کے استاد تھے اور ننوا تیلی کی لڑکی کو بیٹی بنا لیا تھا یہی مُنہ بونی بیٹی کھانا پکا کر انہیں کمرے میں بھیجتی تھی۔ اس کی شادی مولانا نے خاصی دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے تمام اخراجات خود اٹھائے تھے۔ اپنے تیل کا نسخہ بھی اس کے جہیز میں دے دیا تھا۔ اس تیل سے ان کے داماد نے خوب کمائی کی۔

مشہور یہ تھا کہ مولانا نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جوانی میں شادی کی تھی۔ اس سے اولاد نہیں ہوئی۔ مولانا توالیوں کے چکر میں رہتے تھے۔ راتیں انہی میں کالی ہوتی تھیں مگر صبح ہونے سے پہلے گھر ضرور آ جایا کرتے تھے۔ بیوی اکیلی پڑھی تارے یا کڑیاں گنا

کرتی تھی۔ آخر تنگ آکر اُس نے روکنا ٹوکنا شروع کیا۔ مولانا ایک آزاد مزاج آدمی تھے۔ وہ بھلا پابندیوں کو کیسے گوارا کر لیتے؟ ایک دن بیوی کو طلاق دے دی اور عدت پوری ہونے کے بعد نتوائیلی کے بیٹے عبدالحی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

خواجہ حسن نظامی سے مولانا بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ آپ تصوف پر ایک کتاب لکھ دیجیے۔ مولانا کچھ موج میں تھے، رضا مند ہو گئے۔ ورنہ مولانا زبان کے جتنے طرار تھے، قلم کے اتنے ہی پھسڑی تھے۔ مہینے دو مہینے میں کتاب لکھ لی۔ اور مسودہ لے کر خواجہ صاحب کے ہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کتاب کو ادھر ادھر سے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف کی اور بولے۔ ”معاوضہ جو آپ فرمائیں پیش کر دیا جائے“ مولانا نے کہا۔ ”معاوضہ کیسا؟ شیخ، ہم نے تو تمہاری فرمائش پر کتاب لکھی ہے“ خواجہ صاحب نے کہا۔ ”بہت اچھا۔ مگر کتاب میرے نام سے چھپے گی۔“ یہ سنا تھا کہ مولانا کا ناریل چٹھا۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اُس کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور بولے۔ ”خدا خوش رکھے شیخ لاڈ چائے پلو او۔“ خواجہ صاحب نے مناسف ہو کر کہا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟“ مولانا نے کہا۔ ”کچھ نہیں شیخ تم چائے پلو او۔“ مولانا کی آنکھ پر میل نہیں تھا۔ چائے پی اور ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ خواجہ صاحب سے پھر کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ایک بار مولانا سے ایک صاحب ملنے گئے جو اپنے آپ کو ادیب اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھتے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ ”فارسی جانتے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”نہیں“ ”عربی جانتے ہو؟“ انہوں نے پھر وہی جواب دیا۔ ”نہیں“ ”علم معقول و منقول؟“ ظاہر ہے کہ اس کا جواب بھی نہیں ہی تھا۔ اس پر مولانا نے کہا۔ ”بھئی یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمی ہوں؟“ واقعی مولانا علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ وہ جسے بھی چاہتے، یہ فقرہ کہہ سکتے تھے۔

مولانا بڑے نڈر آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دلی میں فسادات ہوئے تو ہندو اکثریت کے حملوں میں سے مسلمان نکل کر مسلمانوں کے حملوں میں آنے لگے تھے۔ مگر مولانا تنہا اپنے کمرے ہی پر ڈٹے رہے۔ لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ اُن کی منہ بولی بیٹی اور داماد بھی

پاکستان چلے گئے مگر مولانا لٹس سے مس نہ ہوئے۔ پاکستان جانے والوں سے مولانا بہت ناراض ہوتے تھے۔ چنانچہ بیٹی اور داماد سے بھی ناراض ہو گئے۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اور شرناہنجیوں کی کھیپ پر کھیپ دلی آنے لگی۔ یہ آنے والے دلی میں خالی گھر ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ڈرا دھمکا کر بھی مسلمانوں سے گھر خالی کرالیتے تھے۔ متفصل گھروں کے تالے توڑ کر گھس جاتے تھے۔ امنی میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ اس بالا خانے پر ایک بڑھا مسلمان اکیلا رہتا ہے۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور تلوار لے کر زینے پر چڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سناٹا تھا۔ بے روک ٹوک صحن میں پہنچ گیا۔ مولانا نے جو اسے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔ "کون ہے تو؟" وہ کچھ ایسا سٹپٹا یا کہ تلوار وہیں پھینک کر بھاگ گیا۔ مولانا نے تلوار اٹھا کر اس کے پیچھے زینے میں پھینک دی۔

ایک دفعہ اور مولانا پر حملہ ہوا۔ اب کے چار سیکھ اپنی کہ پانیں لیے اوپر چڑھ آئے مگر مولانا کو دیکھ کر ان پر ہمت چھا گئی۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مولانا کی عمر اسی سے متجاوز ہو چکی تھی۔ کم بھائی دینے لگا تھا۔ مگر وہ سمجھ گئے کہ یہ چاروں قتل کرتے آئے ہیں۔ بڑے اطمینان سے بولے۔ "آپ جس قصد سے آئے ہیں اسے جلد پورا کیجیے، قاتلوں نے خبر نہیں کیا دیکھا کہ ان کی گنگھی بندھ گئی۔ ایک نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ "جی ہم تو آپ کے درشن کرنے آئے تھے، مولانا نے پھر کہا۔ "ہتھی نہیں، آپ جس کام کے لیے آئے ہیں اسے جلد انجام دیجیے۔ اس میں دیر نہ کیجیے۔"

انہوں نے کہا۔ "جی ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔" مولانا نے فرمایا۔ "اچھا تو چلے جاؤ۔" اور وہ چاروں وہاں سے گداگد گداگد زینے پر سے ایسے گھبرا کر بھاگے جیسے خود ان کی جان خطرے میں ہو۔ سچ ہے، "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟"

مولانا آخر دم تک اپنے بالا خانے ہی پر رہے اور چند مہینے ہوئے کہ اپنی طبعی موت مرے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میرے صحبت مہینے رہی

شوکتِ تھانوی

خدا بخشنے شوکتِ تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو دونوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی۔ عجیب زعفرانِ زاد شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلیے آدمی تھے، سچے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی رگوں میں خون کے بدلے پادہ دوڑتا تھا۔ تڑت پھرت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلا وہ تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ مچھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ کیسے مرسکتا ہے؟ مگر یقین کر دیا نہ کرو شوکتِ واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو رونا چھوڑ گیا۔ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ ”دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکا دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔“ دیکھ لیا نا؟ بتیس سال کے تعلقات کا اتنا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھا گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلنا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی۔

لازم تھا کہ دیکھو صراستہ کوئی دن اور

تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

شوکتِ تھانوی کا نام پہلی بار اُس وقت سنا جب ۳۵ سال اُدھر کسی نے بتایا

کہ نیرنگ خیال کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون ”سمولٹی ریل“ پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔

رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھر ٹک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آ جاتا ہے،

تو ہنسی آ جاتی ہے۔ جب اس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتا چلایا کہ کسی

انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا، یہ مضمون اُس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی۔ اصل

مضمون کا تراشہ حاصل کیا۔ ترجمہ تو ترجمہ، ان دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا تھا کہ مرکزی تصور اس مختصر سے خاکے سے لیا گیا تھا شوکت تھانوی نے اس تصور کو اپنے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا تھا کہ یہ مولہ آنے (بائنو پیسے؟) اٹھی کی تخلیق ہو گئی تھی۔ اور جو خوردہ گیری ہی پڑا تو ٹیکس پیئر کا کون سا ڈراما طبع زاد کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا؟ یونہی چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے اور پڑا ان کا۔ غاصب ہی ہونا ہے۔ اس مضمون کے لکھنے سے پہلے بھی شوکت تھانوی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ پہلے لکھنؤ کے ایک اردو اخبار میں کالم لکھتے تھے، پھر دو اخباروں میں لکھنے لگے تھے۔ میر جالب دہلوی کے ”ہمدَم“ میں ان کے ادبی ذوق نے تربیت پائی۔ ان کے والد ایک یٹ پولیس افسر تھے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوکت آسانی کے ساتھ سب اسپیکر بھرتی ہو سکتے تھے۔ مگر جو شعر و ادب کے چکر میں پڑ جاتے ہیں وہ پھر کسی اور کام کے کپ رہ جاتے ہیں؟ بچپن باپ کے ساتھ کم اور بڑی بہن کے ساتھ زیادہ گزرا۔ یہ بڑی بہن خود بھی ادبی ذوق رکھتی ہیں اور یہ خاتون وہ ہیں جن کے شوہر نامدار مولانا ارشد تھانوی ہیں جو شوکت تھانوی کے چچا زاد بھائی بھی ہیں۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ! ان کے سایہ عاطفت سے شوکت کو شاعر، ادیب اور تھانوی، سبھی کچھ بنا کر چھوڑا۔ ورنہ تھانہ بھون سے شوکت کا کیا تعلق؟ پیدا بنا کس میں ہوئے، پلے بڑھے بھوپال اور لکھنؤ میں۔ اصل نام تھان محمد عمر، تختہ شوکت اختیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی کی دیکھا دیکھی تھانوی کا لاحقہ اس میں ٹانگ لیا۔ اسی لاحقہ کی وجہ سے پطرس کہا کرتے تھے کہ ”خدا جانے کس تھانہ سے ان کا تعلق ہے؟“ بڑوں کی بھول چوک پر پردہ ڈال دینا بین سعادت مندی ہے۔ محمد عمر کو اب کوئی نہیں جانتا۔ شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں ع

اگر پدہ نتواند سپر تمام کند

۱۹۳۶ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملنے آئے ہیں۔ نام پوچھے تو نام نہیں بتائے۔ ان کی یہ بد اخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا۔ سر راند گھر کی بیٹھک میں انہیں بٹھاؤ۔ میں اسی وقت اٹھا تھا میں نے دل میں سوچا کہ انہیں اتنے سوچے

آنے اور نام نہ بتانے کی سزا دینی چاہیے۔ چنانچہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور آدھ گھنٹے بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ سر و قد کھڑے ہو گئے۔ یہ دونوں جوان تھے، جنہیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں پھیلا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ چرباک تھے، ذرا آگے بڑھ کر بولے۔

”ہمیں پہچانیے“

میں نے سر سے پاؤں تک انہیں دیکھا۔ آڑھی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، شہیرے فرار آنکھیں، موزوں بینی، لبوں پر پان کی ہلکی سرخی، تڑشی ہوئی مونچھیں، ڈارھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وائنٹس کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویر میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔

”شوکت تھا نوی۔“ مسکرا کر بولے۔ ”آپ نے ٹھیک پہچانا۔“ یہ کہہ کر معاف کیا۔ پھر اپنے سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ”اور یہ؟“ میں نے انہیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی ساختیہ تھا دونوں کا، سوائے اس کے کہ ان کے چہرے پر سینک مہیں تھی۔ میں نے کہا۔

”یہ آپ کے نفسِ ناطقہ نسیم امہونوی ہو سکتے ہیں۔“ شوکت نے کہا۔ ”بھٹی خوب اندازہ لگایا۔“ نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ ”حسیم“ نکلتا تھا۔ اور ”ساقی“ کے تبادلہ میں آتا تھا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر ”سرپنچ“ ایک مزاحیہ اخبار (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ محنتی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر ٹیراکام کیا اور اب تو خود نسیم صاحب بھی ایک بھاری بھر کم مصنف ہیں۔

باروں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلی کی ایک خاص چیز ہے اور دلی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے انہی ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چوں کہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا

کر اٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگر پہ اور دوسرے لوازم لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انکیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے نار اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہو گئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا: "بھئی تمہارے ہمان نہیں آئے؟" میں نے کہا: "لکھنو والے ہیں: سکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے؟" لو صاحب، سات بھی سچ لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمرہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ۔ اس زمانے میں میں ناک پر کھئی مہنیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب اٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا: "ماموں جان، یہ سارا سامان زمانہ میں بھیج دیجیے؟" وہ گھبرا کر بولے: "کیوں میاں کیوں؟ منظور اس انتظار اور کر لو؟" مگر میرا پارہ چرٹھ چکا تھا۔ میں نے کہا: "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں مہنیں کھلاؤں گا۔" ماموں جان نے کہا: "یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔" مگر میں نے سارا سامان اٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ ہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا: "چائے اور پان بھیج دینا؟" انھوں نے پوچھا: "اور نہاری؟" میں نے کہا: "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی فورمہ ہو گیا۔ اُسے مت بھیجنا۔" انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں: "عجب اوندھی مت کا آدمی ہے؟ اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔ میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا: "ہمیں کچھ دیر ہو گئی؟" میں نے کہا: "جی ہاں۔" عطا

حریفان بادہ باخوردند و رفتند

بولے: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا تھا۔ انھوں نے دو گھنٹے تک

آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھاپی کر رخصت ہو گئے۔"

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں۔ دہلی کے تشریف سوار ج بھنگنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکے ہیں۔ ویسے بازاروں میں

مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چرٹھے تک بکتی رہتی ہے۔"

”یہ تو بُرا ہوا۔“

”وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کیسے کل

کس کس سے ملے؟“

شوکت صاحب نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ، ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے اور پروفیسر اکبر حیدری سے ملے۔ جو اس قدر تپاک سے ملے کہ گفتگو ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال ”بھی انہی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور رات کے کھانے پر بھی پروفیسر صاحب نے انہیں مدعو کر دیا۔“

یہ پروفیسر صاحب تھے تو دراصل انبالہ کے، مگر دہلی ہی میں آکر بس گئے تھے۔ اس زمانے میں بعض لوگ گوروں کو اردو پڑھایا کرتے تھے اور منشی کہلاتے تھے۔ سب سے پُرانے منشی استاد بیخود دہلوی تھے۔ وہ اپنی کبر سنی کے باعث اس پیشے کو چھوڑ چکے تھے۔ اکبر حیدری اچھے وجیہ آدمی تھے۔ ان کی تعلیم شاید اسکول تک ہی محدود رہی تھی۔ مگر اپنی ذہانت اور بورڈ توڑ سے اس پیشے میں گھس گئے تھے اور اپنے ہم پیشہ سُسرالی عزیز کے سہارے بڑھتے چلے گئے، اور انہی کی طرح گوروں کے لیے دو ایک کتابیں بھی لکھ دی تھیں۔ جو کورس میں داخل ہو جانے کی وجہ سے خوب بھرتی تھیں۔ چنانچہ منشی اکبر خاں دہلی میں آنے کے بعد چند سال کی لوٹ پھیر میں خاصے مال دار ہو گئے تھے اور مچھلی دالان میں ان کا ایک عمدہ مکان بھی بن گیا تھا۔ شعر اچھے خاصے کہہ لیتے تھے، اور غمناز کے نام سے ایسی نثر بھی لکھ لیتے تھے، جس میں کسی کو بُرا مچھلا کہنا ہو۔ تمول کے ساتھ ان کے تعلقات بھی وسیع ہوتے چلے گئے تھے اور وہ پروفیسر اکبر حیدری مشہور ہو گئے تھے۔ ویسے طبیعت کے بھلے آدمی تھے۔ اور ملنے جُلنے میں خوش اخلاق تھے۔ ہم سے بھی ان کی یاد اللہ تھی مگر ہم سے ان کی میزان نہیں ٹپتی تھی۔ شوکت صاحب نے بتایا تھا کہ رات کو ہم ان کے ہاں دعوت میں گئے تو وہاں دو اور ایڈیٹروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک ”نیرنگ“ کے ایڈیٹر عشرت رحمانی اور دوسرے اخبار ”ریاست“ کے سب ایڈیٹر حنیف ہاشمی۔ حکیم یوسف حسن صاحب اس زمانے

میں جتنے ننومند اور قوی الجھنہ آدمی تھے، حنیف ہاشمی اسی قدر اعصابی اور نحیف الجھنہ۔ اچھی خاصی یائیں ہو رہی تھیں کہ حنیف ہاشمی پنجاب اور یوپی کا قضیہ لے بیٹھے۔ اکبر حیدری انبالہ کے تھے۔ نہ ادھر کے، نہ ادھر کے، بلکہ بین بین۔ بچارے بار بار اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے، مگر حنیف ہاشمی کانپ کانپ کر اور لرز لرز کر پھر کچھ کہہ دیتے۔ ادھر یہ دونوں بھی کچھ کم بولنے والے نہیں تھے۔ پہلے تو انہوں نے کچھ ٹالا۔ مگر جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو یہ بھی لپٹ پڑے۔ عرض شوکت صاحب نے بتایا کہ فضا اتنی مکدر ہو گئی کہ ہم وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر اکبر حیدری نے پکڑ کر بٹھالیا اور فوراً کھانا منگوایا۔ مگر دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا، کھانا کیا خاک کھایا جاتا؟ دو چار لقمے زہر مار کر کے وہاں سے پیچھا چھڑایا۔

میں نے کہا۔ "مجھے یہ روداد سن کر مطلقاً تعجب نہیں ہوا۔ اکبر حیدری جب اکیلے ہوتے ہیں تو مہابت معقول یائیں کرتے ہیں۔ مگر جب دو چار ادیب یا شاعران کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر کی رونق ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔"

اتنے میں چائے آگئی۔

شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "تو کیا واقعی منہاری نہیں ملے گی۔" میں نے کہا۔ "منہاری اب آئندہ کسی اور موقع پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے، اور پان کھائیے۔"

اس واقعہ کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ وہ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انہوں نے میرے ساتھ کبھی مسخر اپن نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت خفانوی سے میرے تعلقات اڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے معاوضہ نہیں لکھتے۔ لہذا جب کبھی ان سے مضمون لکھوانا ہوتا تو انہیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اور اُس زمانے میں معاوضہ ہی کیا ہوتا تھا؟ دس روپے منشی پریم چند

پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی نے پندرہ روپے انہیں دیے ہیں تو ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ سو دو سو میں شوکتِ مقلانوی اپنا ناول دینے پر تئیں رہتے تھے۔ ایک دفعہ آغا سرخوش کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ آغا صاحب نے پوچھا: "اس کا نام کیا ہے؟" کہا: "جو جی چاہے نام رکھ لو۔" آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیدڑ بنوایا اور اس گیدڑ کا چہرہ شوکتِ مقلانوی کا بنوایا۔ گیدڑ کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا "مجھے خرید لو" یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ لٹہ ہماری کتاب اپنے مکتبہ سے چھاپ دو۔

شوکتِ مقلانوی میں خوبی کہیے یا عیب، یہ تھا کہ ان کے کسی کام میں استواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے، اس لیے وہ زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ جب دلی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکتِ صاحب کو بھی تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اسے انہوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اُس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائریکٹر پروگرام۔ شوکتِ صاحب ان دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے۔ کچھ روز بھی دہلی تھی۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے، اور لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک اردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) ان دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشا انہیں بھیج دیا۔ اس کے صلہ میں انہیں دلی مزید پروگراموں کے لیے بلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انہیں مسودہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ریڈیو میں انہیں اخبار کے مقابلے میں ڈگنی بلکہ تیگنی تنخواہ مل گئی اور ان کے دل در دُور ہو گئے۔ اخبار نویس نے انہیں زود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فیچر اور ریڈیو ڈراما کی تکنیک کو سمجھ لینے کے بعد انہوں نے کچھ لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے تھے۔ لکھنے میں انہیں

کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے تھے، اچھا لکھنے تھے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انہوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر "منشی جی" شروع کیا، جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دل چسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور مہابت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو "منشی جی" نے "قاضی جی" کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا۔ پھر شوکت صاحب کراچی آگئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روج رواں قاضی جی تھے۔ جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں تک اکثر سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کر رہا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنت میں رہتے تھے مگر ہر معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ ان کے پوپلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں، بھولی بھولی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقال پیدا ہو گئے تھے۔ اور محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے، وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے تھے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سیکڑوں مسودے لکھے اور میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈ کاسٹ سنے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا۔ سب میں ایک ہی جیسی گفتگی اور تازگی پائی۔

یہی کیفیت ان کی کالم نویسگی کی تھی۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت صاحب اخبار "جنگ" سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انہیں روزانہ ایک مزاحیہ کالم "غیرہ وغیرہ" لکھنا ہوتا تھا، اور ہفتہ میں دو ایک ادارے بھی۔ نواب سعادت علی خاں نے انشا اللہ خاں سے فرمائش کی تھی کہ دو لہیفے روز سنا دیا کرو، تو چند روز میں انشا کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک سے کہتے۔ "کوئی نقل، کوئی چٹکلا یا دہو تو بناؤ۔ میں لوں مرچ لگا کر تو اب کو خوش کر لوں گا" شوکت صاحب کا شگفتہ رقم قلم روزانہ چلتا رہا اور ظرافت کے پھول کھلانا رہا۔ پنڈھی جانے کے بعد پورے اخبار کی ذمہ داری بھی ان پر عاید ہو گئی تھی مگر وہ "پہاڑ تلے" کے عنوان سے کالم برابری لکھتے رہے

اداریہ کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مثلاً انھوں نے اپنی بدلتی لکھنی شروع کر دی تھی۔ افسوس کہ اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیار سے ہو گئے۔

پاکستان بننے سے شاید دو ڈھائی سال پہلے وہ دکنی ننخواہ پر سچولی فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویسی کے لیے چلے گئے تھے۔ اس کمپنی میں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے ساتھ کام کیا۔ فلم کا سیناریو نے تکلف لکھنے لگے تھے یہیں ایک فلم میں انھوں نے اداکاری بھی کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد: "اں قذح بشکست و اں ساقی نہ ماند" تاج صاحب کے ساتھ وہ بھی لاہور ریڈیو میں آگئے تھے۔ پاکستان کے تعمیر پر وگرام میں انھوں نے "قاضی جی" لکھنا شروع کیا تھا اور سب سے زیادہ مقبول پروگرام انھی کا ہوتا تھا۔

"یک درگیر و محکم گیر" کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے، پیسے کے میت تھے جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا دکھائی دیتا اسی کو اختیار کر لیتے۔ مکالمہ نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر سچولی بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو سچولی فلم کمپنی میں آگئے، وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آگئے۔ پھر "جنگ" اخبار میں چلے گئے۔ پیسہ انھوں نے خوب کمایا، مضامین سے، کتابوں سے، ریڈیو سے، اخباروں سے، مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں شرح کرنے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست، ظاہر کرتے تھے۔ پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سگریٹ، تنک وہ نہیں پیتے تھے۔ سینما، تھیٹر، کلب، سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا۔ اور انھیں کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے تھے۔

شوکت ننھا نوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے۔ اسی الدنی کی انھوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ کوئی ۲۵ سال ہوئے، انھوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلام موزوں کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ اور بہت کچھ "شوکت" کے کلام میں نہیں تھا۔ چند سال سے انھوں نے مزاحیہ اشعار اور طنزیہ نظمیں بھی کہنی شروع کر دی تھیں۔ یہ اثر تھا سید محمد حفیظ کی صحبت کا جن کے سایہ میں انھوں نے دو ایک

نظیں کہی ہیں، مگر ان میں وہی آؤر د اور بے رنگی ہے جو ان کے سنجیدہ کلام کا عیب ہے۔ شوکت صاحب کا معاملہ کچھ اکبر الہ آبادی سے مناجلتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا آغاز سنجیدگی سے ہوا۔ مدتوں اس بحر میں شناوری کرتے رہے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک بار اتفاق سے جو غوطہ مار کر نکلے، تو وہ مقصود ہاتھ آگیا۔ یہ موتی تھے طنز و مزاح کے، جن کی مانگ چاروں طرف سے ہونے لگی۔ تب اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کا فطری جوہر ظرافت ہے اور انہیں اسی جوہر کو اُجالنا چاہیے۔ لہذا انہوں نے اسے منشق کی سان پر چڑھایا اور مرادلت سے ایسے پہاڑ تراشے کہ اس کی آب و تاب ایک دیکھنے دکھانے کی چیز بن گئی۔ شوکت صاحب بھی برسوں اخباروں میں لکھتے رہے، مگر جب سن اتفاق سے "سودیشی ریل" ان کے قلم سے نکلی تو اس کی مقبولیت نے انہیں بتایا کہ ان کا جوہر اصلی مزاح ہے۔ اگنمود چاہتے ہو تو اسی کو چمکاؤ۔ چنانچہ شوکت نے اپنی بساط بھر اسے چمکایا، اور اس تیر رفتار سے کہ دو سال ہی میں موج تبسم، بھر تبسم اور دو اور تبسم، چار مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہو گئے۔ مگر ان کی زود نویسی نے انہیں طنز و مزاح کی بلندیوں کو چھوئے نہیں دیا۔ آج تک ایورسٹ کی چوٹی کسی نے دوڑ کر سر نہیں کی۔ یہ بڑا احبان جو کم کا کام ہے جس میں قدم قدم پر احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنا جھنڈا گاڑ کر لافانی ہو جاتا ہے۔ دوڑ کر ہانپ جانے والوں میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی ہیں۔ قدم قدم چل کر چوٹی تک پہنچنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس۔ ثانی الذکر نے زندہ سلامت واپس آجانے کے بعد کوہ پیمائی کا سامان ایک طرف ڈال دیا۔ صدیقی صاحب بہت زیادہ سخت کوشش ہیں۔ تن سنگھ کی طرح بار بار چوٹی پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی خوش اخلاق آدمی تھے، اور جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے، ان سے تعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انہیں بناتے تھے جن سے انہیں فائدہ پہنچتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔

بانوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یوپی والوں کا شیوہ تھا مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنوں کو

یشیٹے میں آنا رکھا تھا، اور ان سے کما حقہ، فائدہ اٹھاتے تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے تھے۔ "ہنیں، یہ بات تو نہیں ہے۔"

ایک دفعہ میں شوکت تمھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "ایک لطیفہ یاد آگیا، ذرا نظامی صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) کو سناؤں؟" وہ لطیفہ سنانے چل دیے۔ میں نے ان کے دوست سے کہا۔ "اس نے تو خوشامد کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ہے؟" انھوں نے کہا۔ "بھیا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ پول سنگ بڑی چیز ہے۔"

"یہ نیا لفظ تم نے کیا بولا؟"

"پول سنگ۔"

"یعنی؟"

"بٹرنگ — ممکن لگانا — پول سن کا ممکن ہوتا ہے نا؟"

پول سنگ، بٹرنگ، ممکن لگانا، ممکن بازی کرنا۔ یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا۔ "آج بازار میں ممکن ہی غائب ہے؟" "کیوں؟ کیا ممکن بھی چور بازار میں چلا گیا؟"

"ہنیں، فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سا۔"

ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا۔ انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدفِ ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی خودی اور خود داری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی منہ پر کہاں کرتے تھے۔ صرف دو مدیں ایسی

دکھائی دیں جن میں انہیں ضرور اپنی گہرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔ انہوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔ یہ ڈبیا تقریباً بہر ملاقات بطور مہبت کا میاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اُس پر بٹوے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الپچی، لونگ، جاوتری، منتھال کی نمٹی سی شیشی، سبھی کچھ ہوتا تھا۔ کہاں تک کوئی بچتا، مار ہی کھا جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی و سخن بازی، نو وارد رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن لاہور پر اپنے چہرہ اسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے "آپ کو دیکھیے، نبوی کٹ سگریٹ پر آپ کی تصویر ہے۔" اور واقعی میں اُس غریب کی عین عین وہی شکل تھی جو نبوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا۔ "جائیے، جا کر چائے لائیے۔"

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی۔ "یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، میرے صاحب زادے ہیں۔" اور ان صاحب سے کہا۔ "انہیں تم جانتے ہی ہو گے، شاید احمد دہلوی ہیں۔" انہوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں "وعلیکم السلام" کہہ کر بیٹھ گیا۔ وہ صاحب "اچھا، میں چلتا ہوں" کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا۔ "جس بجلے آدمی کو دیکھتے ہو کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔" انہیں شرم نہیں آتی؟ "بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "مہنیں واقعی میرا بڑا لڑکا تھا۔ پی، اے ایف میں نوکر ہے" مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرتِ رحمانی آگے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے؟" انہوں نے کہا۔ "قد میں بڑا ہے۔ آپ ان کی عمر کیا سمجھتے ہیں؟" مجھ سے، آپ سے، بڑے ہیں یہ حضرت۔ پچاس سے اوپر ہیں۔ ۳۰-۳۲ سال کا تو لڑکا ہی ہے۔" اُس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے۔ بالِ نوب گھنے اور کالے تھے۔ سفید بال نہ تو سر میں تھے نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھڑی مہنیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں "کوڑے کے پاؤں"۔ دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بڑبڑاری اور سنجیدگی آجایا کرتی ہے مگر شوکت صاحب

کی بات چیت کا انداز بالکل مہینیں بدلاتھا۔ جوانی کا وہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ مسخرا پن کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیر سنگالی کا ثقافتی وفد گیا تھا اس میں لاہور سے امرت سرتک اور امرت سر سے دہلی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد حفیظ، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی یاد لکھنے اور چرب زبانی سے سب کو دبا لیا کرتے ہیں، مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

پان کے فریج کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے۔ وہ روزانہ ایک سوڑا بدلتے تھے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ بعد میں سوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ جیسے الغریب خواہ مخواہ مرد معقول ہوتا ہے اسی طرح بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلو امبھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ، ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے کبھاؤ ان کے دفتر وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چہرہ اسی مریخ زریں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اُسے دیا کہ صاحب کو دے آئیے۔ اُس نے بڑی بے مہری میری طرف دیکھا اور بولا۔ "بچہ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں، میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی متھوڑی دیر بعد آ کر مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بیچ پر آ بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ اُس نے مجھ سے بات کرنی بھی گوارا نہ کی۔ میں نے کہا۔ "آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آئیے۔ مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔" بولا۔ "اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں، ابھی مٹھرو۔" مٹھرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزر لیا تو میں نے کہا۔ "صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی کام سے مہینیں آیا ہوں۔ آپ اطلاع تو کر دیجیے۔" وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اُس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آکر خاموش

بچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "چٹ مہنیں دی؟" اس نے "مہنیں" کہہ کر سٹھ پھیر لیا۔ میں
 بتا رہا، مجلسا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے
 دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے۔ "ارے! آپ
 یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں، پون گھنٹے سے۔ اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے
 دفتر نہ بلائیں۔ میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ "آئیے آئیے" کہہ کر گلے میں
 ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ بولے۔ "آپ اندر کیوں نہ آ گئے؟" میں نے
 کہا۔ "وہ جو باہر ایک کتا کھڑا ہے اسے میں نے چٹ دے دی تھی۔ مگر اس نے اندر مہنیں
 پہنچائی۔ کیا آپ کے ہاں بھی اندر اطلاع پہنچانے کے دس پانچ روپے دیے جاتے ہیں؟"
 ہنس کر کہنے لگے۔ "مہنیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔" پھر میرے بگڑے ہوئے تئور دیکھ کر بولے۔
 "آپ چائے پیئیں گے، کچھ کھائیں گے؟" اور بضر میرے جواب کا انتظار کیے گھنٹی بجا کر اپنے
 سُرخ زریں کو بلایا اور کہا۔ "چائے لاؤ۔" پھر خود ہی کہنے لگے۔ "بھائی کیا پوچھتے ہو ان سپراسیول
 کی حالت۔ بس کچھ کہنے کا مقام مہنیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جناب اس کی گرم شیر دانی میری
 شیر دانی سے دگنی قیمت کی ہے۔ میرے پاؤں میں چھ روپے کی جوتی ہے، وہ تیس روپے کا
 شو پہنے ہوئے ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں خاطر میں لانا۔ سمجھا ہو گا کہ کوئی عرض مند مہاجر صاحب
 سے کچھ مانگنے آیا ہو گا۔" ممتاز صاحب شرمندہ ہو کر بولے۔ "مہنیں بھائی مہنیں۔ تم مجھے
 معاف کر دو۔"

تو شوکت صاحب ہمیشہ ایسی یا د لاتی عمدہ لباس پہنا کرتے تھے۔ ورنہ انہیں بھی
 ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا۔ مثل مشہور ہے "الناس باللباس"۔ یہ کوئی آج کا دستور
 مہنیں ہے، قدامت سے یہی چلا آتا ہے۔ شیخ سعدی کو دعوت میں داخل ہونے سے دربان
 نے روک دیا تھا۔ جب وہ حبیہ قبریہ پہن کر آئے تو عزت و تکریم کے ساتھ انہیں اندر پہنچایا گیا۔
 جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شور بے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا۔ "پہلے
 تو کھا۔" لوگوں نے کہا۔ "حضور یہ کیا۔" فرمایا۔ "اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔"
 پتہ ہے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کو مہنیں۔ لہذا مرزا ظاہر دار بیگ بننے ہی میں عزت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ اور اونچی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آٹے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں ساک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بلکہ ہمارے "بڑے آدمیوں" نے بھی اسے اپنی شانِ امارت میں داخل کر لیا ہے کہ جب ان کے ہاں "مسز زہمان" آرہے ہوں تو ایک بار "کا بھی اپنے ہاں اہتمام کریں۔ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے مگر ان "قاضی جی" نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے ایسے ایسے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

عورتوں کے باب میں بھی شوکت صاحب نذیدے نہیں تھے۔ بلکہ خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا، چھوٹے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ اُن پر عاشق ہو گئی۔ اور لگے اُس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی تو جوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ انھی کی بے تکلف گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ کہی اداس شباب میں "جنگلی جٹی" بھی بولیا کرتے تھے۔ "مگر اس کا انھیں لپکا نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک طرح دار جوان تھے وہ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کر بگڑتے، مگر اللہ نے انہیں اس خرابی سے محفوظ رکھا۔ — وہ بھی کسی حد تک!

مولانا نیاز فتح پوری

۲۴ مئی (۱۹۶۶) کو صبح کی خیروں میں ریڈیو پاکستان نے یہ عمر ناک خبر سنائی کہ اردو کے مشہور نقاد اور ادیب نیاز فتح پوری کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نیاز صاحب کی سناؤنی سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا مگر ہاں دل پر غم و اندوہ کا ہجوم ہو گیا۔ تعجب یوں نہیں ہوا کہ نیاز صاحب کئی مہینے سے عیال سے بیخبر ہو چکا تھا کہ ان کے مرنے میں کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ اس وقت خیال ہوا تھا کہ شاید نقلی سینیسی کی کسی خرابی کی وجہ سے یہ تکلیف ہو گئی ہوگی۔ مگر پھر یاد آیا کہ نیاز صاحب نے کبھی نقلی سینیسی لگائی ہی نہیں۔ میں نے ان کے پوئلہ مرنے کو دیکھ کر خود ان سے ایک دعوت میں پوچھا تھا کہ "آپ اپنا چوکا کیوں مہینے بتوا لیتے؟" میرے اس بدتمیزی کے سوال پر انہوں نے متبذم ہو کر فرمایا تھا کہ "ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے مرنے میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس میں سینیسی لگائی جائے۔" میں نے سوچا کہ جیسے نیاز صاحب کی ہر بات میں ایک الوکھا پن ہوتا ہے، یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ نقلی دانت ان کے مرنے میں مہینے سما سکتے۔ پھر میں نے کھانے کے دوران میں مولانا کی طرف دیکھا تو وہ بغیر کسی زحمت کے کھانا کھا رہے تھے۔

ہاں تو نیاز صاحب کے انتقال کی خبر سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ کیوں کہ بعد میں ان کی تکلیف کے بارے میں ڈاکٹروں کی متفقہ رائے یہ ہو گئی تھی کہ یہ کینسر ہے۔ میں تو اسی دن مایوس ہو گیا تھا کہ اب مولانا کی زندگی کے دن شمار ہو چکے ہیں۔ بہت جیس گئے تو سال چھ مہینے، اور ہوا بھی یہی مثل مشہور ہے کہ جب تک سانس تب تک آس۔ مولانا کے کینسر کو ریڈیم سے جلانے کا علاج کیا گیا، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کوبالٹ سے علاج ہوا، افاقہ نہیں ہوا۔ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی

پھر معالجوں نے اپریشن تجویز کیا اور مولانا اس تکلیف کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپریشن ہو گیا اور نیا ز صاحب اچھے ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا اندیشہ غلط نکلا۔ مولانا پھر لکھنے پڑھنے بھی لگے اور ان کی افسردگی بھی دور ہو چلی تھی، کہ مرض پھر عود کر آیا۔ بیچ میں صحت کا جو محفوظ اس وقت وقفہ آیا تھا وہ گویا مولانا نے سنبھالا لیا تھا۔ اب کے جو مرض بڑھنا شروع ہوا تو جان لے کر ہی ملا۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ مولانا کا آخری دیدار نہیں کر سکا۔ میں خود تین مہینہ سے قید بستری میں تھا۔ اور چلنے پھرنے سے معذور رہا۔

مولانا نیا ز فتح پوری کی ادبی زندگی کا آغاز اس صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ وہ سر عبد القادر کے محزن کے لیے مضامین لکھتے تھے اور چوں کہ ایک طرز خاص کے لکھنے والے تھے۔ اس لیے عبد القادر صاحب ان کے مضامین کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ اس وقت یعنی اب سے کوئی ساٹھ سال پہلے نیا ز صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کی اکثر نظمیں بھی محزن میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کی طبیعت روایتی غزل گوئی سے نفور تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں ایک سے ایک اچھی نظم کہتے تھے۔ ان کی نثر میں بھی شاعرانہ عنصر بہت نمایاں تھا۔ اور ان کے فقروں میں وہی لطف آتا تھا جو ایک اچھا شاعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ نیا ز صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی انداز پر ہوئی تھی جو قدیم مسلمان شرفا کا دستور تھا۔ یعنی عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی انھیں ملی۔ گھر کا ماحول بھی مذہبی تھا۔ اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ جوان ہونے پر نیا ز صاحب کے چہرے پر ایڈورڈ فیشن کی ڈاڑھی بنتی

لے "میری دائیں ٹانگ کا دوران خون بند ہوتا جا رہا تھا۔ جب دواؤں اور انجکشنوں سے فائدہ نہیں ہوا تو فوراً خون کی رگ کا بڑا اور خطرناک اپریشن مرحوم دلاور عباس سے کرانا پڑا اور نہ ٹانگ ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اپریشن کے بعد پچاس دن تک بستر سے پاؤں نیچے نہیں اتار سکتا تھا۔ ڈھائی مہینے بعد چھڑی کے سہارے چند قدم چلنے کے قابل ہوا۔ اب تین مہینے بعد بھی زیادہ نہیں چل سکتا۔ بس کوئی دو سو قدم۔" (شاہد احمد دہلوی)

اسی ڈاڑھی کی وجہ سے وہ "مولانا" کہلائے۔ آگے چل کر جب ڈاڑھی غائب ہو گئی تو علامہ "کہلانے لگے۔"

نیاز صاحب نے اسکول میں انگریزی بھی پڑھی تھی مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ کالج کی تعلیم حاصل نہ کر سکے اور سب اسپیکر پولیس ہو گئے۔ مگر ملازمت کی قید و بند انہیں گوارا نہ ہوئی اور نوکری چھوڑ چھاڑ ہمیشہ کے لیے ادب کے ہو رہے۔

۱۹۱۳ء میں آگرہ سے شاہ دلگیر نے ماہنامہ "نقاد" جاری کیا۔ اس کے مخصوص لکھنے

والوں میں ہمدی افادی اور نیاز فتح پوری تھے۔ خود شاہ دلگیر اچھے شاعر اور بہت اچھے نثر نگار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک اچھا فقرہ لکھنے کے لیے ہمارے بعض اہل قلم کئی کئی دن الفاظ کی تلاش میں گزار دیتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ نیاز صاحب ٹیکوڑ سے متاثر ہونے شروع ہوئے اور "گیتا بجلی" کا ترجمہ انہوں نے "عرضِ نغمہ" کے نام سے کیا۔ یہی ترجمہ ہمارے ان شاعرانہ ادب پاروں کی بنیاد ہے جنہیں "ادبِ لطیف" کا نام دیا گیا۔ نیاز صاحب اسکو وائلڈ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ بالخصوص اس کی نثری نظموں سے۔ نیاز صاحب کی ایسی نثر کا نتیجہ تو بھلا کون کر سکتا تھا۔ ہاں نقالی میں ایک جم غفیر نے لکھنا شروع کر دیا۔

ہر بوا الہوس نے حُسنِ پرستی شعاہ کی

اب آہر دئے شیوہ اہل نظر گئی

وہ مٹی پلید کی ان نقالوں نے ادبِ لطیف کی کہ لوگ اس کے نام سے گھن کھانے لگے۔

نقاد چپد سال چل کر بند ہو گیا مگر اپنی ایک روایت چھوڑ گیا

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود

نقاد کے کچھ عرصہ بعد لکھنے والوں کا ایک حلقہ "یارانِ نجد" کے نام سے قائم ہوا۔ اس

میں من جملہ دیگر اہل قلم حضرات کے نیاز فتح پوری، دلگیر اکبر آبادی، خلیقی دہلوی، منصور

اکبر آبادی، ادراک احمد (یعنی لطیف الدین احمد) جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔

"یارانِ نجد" ہی کی تحریک پر آگرہ سے ماہنامہ نگار "جاری ہوا جس کے رئیس التحریر

نیاز فتح پوری مقرر ہوئے۔ اس بات کو اب ۴۴-۴۵ سال ہو گئے۔ نیاز صاحب کے قلم

کاشتباب اور ل۔ احمد کی نگارش لطیف کے جوہر بھی نگار میں کھلنے لگے: جگہ کے علمی اور ادبی مضامین نے سارے ملک میں دھوم مچا دی۔

نیاز صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی کام کر چکے تھے اور مولانا کے طرزِ تحریر سے بھی متاثر ہوئے تھے مگر مولانا کی ادق بلاغت کو سہل الفہم بنا کر نیاز صاحب نے اپنے اسلوب میں ڈھال لیا تھا۔ بات کہنے کا انداز نیاز صاحب کا سب سے جداگانہ تھا۔ پڑھنے والے ان کی نگارشات پڑھنے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ ان کے اندازِ بیان پر بڑے بڑوں نے ہاتھ ڈالا مگر اس کی سادہ پرکاری کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ نیاز صاحب اپنے اسلوبِ تحریر کے خود ہی مخترع بھی تھے اور خود ہی خاتم بھی۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میسر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

نیاز صاحب نے زمانہ شباب ہی میں اپنا ناول ”شہاب کی سرگزشت“ لکھا تھا۔ جوانوں کے لیے یہ ناول ہرزیاں بن گیا تھا۔ دراصل یہ ناول اتنا زیادہ ناول نہیں ہے جتنا کہ ایک ادبی شہہ پارہ۔ اس کے فقرے کے فقرے لوگوں کو ازبیر تھے۔ نیاز صاحب کے ایک غائبانہ عاشق شہاب کی سرگزشت سنانے بیٹھے تو پوری رات سنا کر ہی اُٹھے۔

جگہ اور نیاز کا یہی زمانہ شروع تھا کہ نیاز صاحب نے ادبیات سے توجہ کم کر کے مذہبیات سے التفات بڑھانا شروع کر دیا۔ ڈاڑھی ان کے چہرے سے معدوم ہو گئی۔ غالباً یہ ان کا تشکیک کا دور تھا۔ معقولات کی حد سے گزر کر نیاز صاحب نے مضحکہ خیزی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے خطرناک نتائج نکلنے ہی تھے۔ ان پر مولویوں کی بلیغ ہوئی۔ کفر کے فتوے لگائے گئے اور ان کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ ان سے معافی نامہ شائع کر لیا گیا۔ ایک دور وہ متنا اور ایک دور لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ نیاز صاحب نہایت پابندی اوقات سے نسا پڑھ رہے ہیں۔

نیاز صاحب کی وفات کی خبر سن کر اتنے بے شمار واقعات یاد آ رہے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس کو بیان کروں۔ نیاز صاحب ایک جوہر قابل تھے۔ اُنہوں نے بڑی محنت

سے اپنی زندگی بتائی تھی اور اپنا وقار قائم کیا تھا۔ وہ شاعر تھے۔ انشا پر داز تھے۔ صاحبِ طرہ ادیب تھے۔ نقاد تھے۔ صحافی تھے۔ عالم تھے۔ فاضل تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان تھے۔

نیاز صاحب بہت خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ کسی قدر لیے دیے بھی رہتے تھے۔ پہلی ملاقات میں لوگوں کو ان کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ عام طور سے لوگ انہیں معزور اور مدمع سمجھتے تھے۔ بعض نوجوان ان کی کتابیں پڑھ کر بڑی عقیدت سے ان سے ملنے جاتے تھے۔ نیاز صاحب ایک مصروف آدمی تھے۔ انہیں ہر وقت پڑھنے لکھنے سے کام رہتا تھا۔ پھر اپنی تعریف سن کر انہیں وحشت ہوتی تھی۔ ملاقاتی صاحب السلام علیکم رسید کر کے مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیتے۔ نیاز صاحب ہاتھ سے قلم رکھتے۔ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے اور سخت اکراہ کے ساتھ ہاتھ بڑھاتے۔ وہ صاحب اپنے دونوں ہاتھوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے نرم و نازک ہاتھ کو ملتے دلتے اور اس عمل سے فراغت پا کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر مل کر سامنے کر سی پڑٹ جاتے۔

”بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔“

نیاز صاحب کہتے: ”جی۔“ اور اپنے کاغذات سنبھالنے لگتے۔ وہ فرماتے: ”آج یہ حسرت پوری ہو گئی۔“

نیاز صاحب کہتے: ”جی۔“ اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگتے۔ وہ فرماتے: ”لکھنؤ ایک کام سے آیا تھا، میں نے کہا آپ سے بھی نیاز حاصل کرنا چلوں۔“

نیاز صاحب کہتے: ”جی۔“ اور اٹھ کر الماری کی طرف جاتے۔

وہ فرماتے: ”آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ مجھے اجازت ہے۔“

نیاز صاحب کہتے: ”جی۔“

وہ صاحب سلام داغ کر رخصت ہو جاتے اور دل میں کہتے کہ ”بڑا معزور آدمی ہے، لا حول ولا قوۃ“

مگر جن سے نیاز صاحب کی دل کی جواری کھل جاتی، وہ جانتے ہیں کہ کس قدر خوش اخلاق اور خوش گفتار تھے۔ جب ان کی جان پر بنی ہوتی تھی اس وقت بھی وہ بعض پڑانے

سنے والوں کی خاطر پلنگ پر سے اٹھ کر باہر آجاتے تھے۔ بیمار پرسی کرنے والا خود نثر مندہ
 ہوتا کہ اس حالت میں انہیں کیوں تکلیف دی۔ خود ہی کہہ دیتا کہ آپ آرام کیجیے۔
 نیاز صاحب پُرانے عالموں کا آخری نمونہ تھے۔ وہ ہر علم میں تیرے ہوئے تھے۔
 معلومات کی ENCYCLOPEADIA۔ ساری عمر علم و ادب کی خدمت کی اور
 فارغ البالی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ سنا ہے کہ علم و دولت کبھی یک جا نہیں ہوتے۔ نیاز
 صاحب دولت دُنیا سے محروم مگر دولتِ علم سے مالا مال تھے۔ دولت کا کیا ہے؟
 آج ہے کل نہیں۔ عشق کی طرح علم کی دولت بھی لازوال ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کے
 علمی کارنامے رہتی دُنیا تک زندہ و تابندہ رہیں گے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
 ثبّت است بر جبریدہ عالم دوام ما

۶۱۹۶۶

LIBRARY
 Anjuman Tafaqqi Urdu (Hind)

فیض احمد فیض

کوئی تین سال پہلے کا ذکر ہے کہ دہلی میں سجاد ظہیر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی معرفت مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ کتاب "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہ سا جھے کی ایک یاؤلی ہنڈیا تھی، جو ادب کے چور ہے پر پھوٹی تھی۔ اس کے ایک سا جھی سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس لیے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا اور سجاد ظہیر سے ملوایا۔ بہت ہوش مند آدمی نکلے۔ لندن میں کئی سال رہ کر واپس آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور بردبار۔ سنستے بھی تھے تو خندہ دندان نما سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس انجمن کے مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہ مہربانی مجھے اس کام کے لیے سب سے زیادہ سوزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت "ساقی" کا سورج چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے، تو ٹھیک ہے۔ انجمن قائم ہو جائے گی" اور انجمن انصاری اور فضل حق قریشی کی مدد سے قائم ہو گئی۔ دہلی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب، اردو اور ہندی کے، اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور مضامین پڑھنے لگے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی ناصر صاحب کے ہاں، کبھی خیرتی صاحب کے ہاں اور کبھی جنت رکنار کے ہاں۔ ایک ایسا ہی جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے کٹے کے پہلو میں ڈاکٹر شوکت انصاری کے بالا خانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاری کے بہت قریبی عزیز تھے اور انھیں کی طرح گاڑھے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔

حالاں کہ برسوں پیرس میں رہ کر آئے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آنے لگے تھے۔ پہلے تو ہم انہیں ادیب یا شاعر ہی سمجھتے رہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی، آئی ڈی والے ہوتے ہیں۔ اگلی دفعہ میں نے انہیں جلسے میں سے نکال دیا۔ اور ان کے محکمے کے افسر عبدالرحمن صاحب سے شکایت کی۔ وہ ایک ہی گرگ باراں دیدہ تھے، بولے۔ "آپ کو روس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔" بولے۔ "تو پھر آپ ان کمیونسٹوں میں کیسے پھنس گئے؟" میں نے کہا۔ "روس یا کمیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" بولے۔ "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریکارڈ بالکل صاف ہے، بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں ماکوئی اور انجمن بنالیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے گھرا کر سجاد ظہیر کو پوری رُوداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلاں کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا۔ "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے۔" ان کے اس خلوص سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دلی کی انجمن فوراً بند کر دی، اور اس کی بجائے "انجمن تہذیب ادب" قائم کر دی۔ میں نے اپنی پیش رو انجمن سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور اس کے جلسوں میں سی، آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔

ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیران اور شرمندہ ہو کر بولے۔ "آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیض ہیں۔ اسلامیاہ کالج امرت سر میں پروفیسر ہیں؟ میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لیے خاموش ہو رہا۔ جلسہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے۔ ان پر گفتگو ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ واہ وا ہوئی۔ آخر میں جناب صدر نے فیض صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے اذراہ انکساری نہیں نکرڈ کی مگر جب انہوں نے اپنی ایک نظم سنانی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے مچھے کر یہ پر بین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور، ایک اور کی آوازیں آتے لگیں۔ ہم سب ان کا کلام سن کر بہت خوش ہوئے اور

وقتِ رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد، بلکہ تین چار سال بعد لاہور میں مشہور ادیب ایم اسلم صاحب کے مکان پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ساتھ فیض صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں اور مجھے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ لہذا سلام دعا اور مزاج پرسی سے آگے بات نہ چلی۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر تاثیر کی میم صاحب کے ساتھ جو ان کی ایک بہن آئی تھیں، ان سے فیض صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔ لہذا فیض اور تاثیر اب ہم زُلف ہو گئے ہیں۔

جب دوسری عالم گیر جنگ نے زور پکڑا تو یہ عجیب سا یا پلٹ ہوئی کہ ہمارے بعض ادیب، جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے، فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لیے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دلی میں دکھائی دیے۔ مجھے تو جیٹکا سا گنگا مگر وہاں آنکھ پر میل بھی نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائریکٹر بن کر آ گئے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا۔ کیوں کہ یہ تو کھڈر کا کرتا اور کھڈر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیے۔ کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حدیہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے۔ ایک صاحب تھے عارف آل انڈیا ریڈیو میں، انھوں نے بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی۔ ایک اور صاحب تھے بدر، وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے۔ حدیہ کہ انم راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے بے ہنگم حسرت مرحوم اپنے بے ڈول جسم اور فٹ بھر آگے چلنے والی ٹوند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے انھیں پہن لیا ہے اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کیس چکر میں پھنس گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تاثیر نے فیض کو پچانسا ہے تاکہ وہ فخر سے یہ نہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خطِ غلامی نہیں لکھا۔ مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ :

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جنگ کے زمانے میں دہلی میں ادیبوں کی اچھی خاصی کھیپ آگئی تھی۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے اپنے گرد ادیبوں کا خاصہ بڑا حلقہ قائم کر لیا تھا۔ م، راشد، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، غلام عباس، محمود نظامی، بہزاد لکھنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آچکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چمران حسن حسرت، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منٹو، میراجی، اوپنر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، خالد علی خاں اور کرشن چندر بھی ریڈیو میں آگئے۔ فوجی دفتروں میں مجید ملک، تاثیر، فیض اور بدر آگئے تھے۔ سونگ پلیٹی میں حفیظ جالندھری تھے اور پولی ٹکنک میں حمید احمد خاں، پطرس کے اشارے پر ایک اونچے درجے کا ادبی حلقہ نئی دہلی میں بنایا گیا۔ اور اس کے جلسے کبھی پطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بنگلے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کیوں یاد فرمایا جاتا تھا۔ پطرس اگر واقعی دل سے کسی کی عزت کرتے تھے تو وہ پروفیسر مرزا محمد سعید تھے جن سے انھوں نے ایک زمانے میں پڑھا تھا۔ ان کی بے اندازہ علمیت کے پطرس فائل تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حلقے کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے "اردو شاعری میں عورت" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نکلی کہ اس پر پطرس نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ مرزا صاحب دوچار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ پطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں کہ انھوں نے دانستہ یا نادانستہ آغازِ کلام اس فقرے سے کیا کہ "یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب روم کی تہذیب سے قدیم تر ہے" اتنا سننا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آگیا۔ چپک کر بولے۔ "جی ہاں، میں جانتا ہوں اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں" اور پھر جو ان کے علم کے سمندر میں طوفان آیا ہے، تو انھوں نے ادھ گھنٹے میں قدیم تاریخ کو کھنکال کر رکھ دیا۔ بخاری صاحب نے برباب مسکرا مسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے، جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پطرس نے چپکے سے میز پر چائے کا سامان لگوایا اور مرزا صاحب کا لکچر ختم ہوتے ہی اعلان

کہ دیا کہ "ایسے حضرات چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریر میں مزا آگیا۔ اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پطرس جو عزت مرزا صاحب کی کہتے ہیں، واقعی مرزا صاحب اس کے مستحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب پھر کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آجاتا تھا۔ ایک دفعہ دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت پطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے "برقاب سے جسم" والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ "برف سے جسم تو ہوتے تھے، یہ برقاب سے جسم کیا ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جو برف جیسے نہیں بلکہ بے کے پانچ جیسے ہوتے ہیں۔" "لا حول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" میں نے انہیں اور جلانے کے لیے کہا۔ "بات تو ہوئی۔ جو لطف برقابی میں ہے وہ برف میں کہاں۔ ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں! حسن خانہ و برقاب کہاں سے لاؤں؟ کوئی تو بات ہے جو انہوں نے برف نہیں باندھا، برقاب باندھ گئے۔" ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

جنگ ہی کا زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانہ علم و ادب پر اردو بازار میں آئے۔ یہاں مغرب اور عشا کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا جھگڑا رہتا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشا کی اذانیں ہونے لگیں تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کہ ایڈورڈ پارک لے گئے اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ "میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟" میں نے کہا۔ "ضرور شائع کروں گا۔" بولے۔ "تو کیا ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار پیشگی دے دیں؟" میں نے کہا۔ "روپیہ کب چاہیے؟" بولے۔ "جب آپ دے سکیں۔ میں کشمیر جا کر ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا" اور واقع میں جب ایک مہینے بعد وہ کشمیر سے واپس آئے تو انہوں نے میرے گھر آکر "شکست" کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھائی مہینے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر تنقید لکھی۔ اٹا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جیسے دیکھیے وہ

کہہ رہا ہے کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشکت نے کہا۔ "میں نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیا ہے، مگر میں پندرہ سولوں گا" میں نے کہا۔ "اگر شکست سے بہتر لکھو گے تو پندرہ سو ہی دوں گا" مگر وہ ناول نہیں لکھا گیا۔ عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لیکر "لکھنا شروع کر دیا۔ منٹو نے ایک ناول دھر گھسیٹا، اور خود ہی اُسے ناپسند بھی کر دیا۔ سنا کہ ڈاکٹر تاثیر ناول لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ ان سے مل کر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ "ارادہ تو ہے مگر آپ فیض سے لکھو ایسے" فیض صاحب سے ان کے فوجی دفتر میں ملا، بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بولے۔ "چھ سو پیشگی دے دیجیے" میں نے چیک وہیں کے وہیں حوالے کیا۔ حسرت صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے۔ "مولانا یہ آپ نے کیا ناول شائع کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ لکھیے نا" بولے۔ "دو سو روپے پیشگی دے جائیے" ان کی خدمت میں بھی چیک پیش کر دیا۔ دو تین مہینے بعد فیض صاحب نے روپیہ واپس کر دیا کہ ناول نہیں لکھا گیا۔ حسرت صاحب نے نہ ناول دیا نہ روپے واپس کیے۔ بلکہ ان روپوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا، اور میں نے بھی انہیں اس خوف سے یاد دلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ سچ مچ ناول لکھ ہی نہ دیں۔ فیض صاحب کی تنہا مثال ہے کہ انہوں نے روپیہ واپس کر دیا۔ ورنہ کم و بیش پندرہ ہزار روپیہ ان پیشگیوں میں ڈوبا۔ اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے پبلشنگ کے کام ہی سے توبہ کر لی۔

رہا کھٹکانہ پوری کا، دعا دیتا ہوں رہن کو

فوجی خدمت سے سبکدوش ہوتے کے بعد فیض صاحب "امرؤذ" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ چیراغ حسن حسرت بھی اسی دفتر میں آگئے تھے۔ ان حضرات نے اس اخبار کو چار چاند لگا دیے۔ عام اخباروں سے اس کی نمود مختلف تھی۔ خبروں کے علاوہ اس کا ادبی حصہ بھی بڑا جان دار ہوتا تھا۔ یہ اخبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اردو کے سب اخباروں سے یازمی لے گیا۔ انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی تھے۔ اردو کے مضامین تو فیض صاحب کے لکھے ہوئے شاذ ہی دیکھنے میں آئے۔ البتہ انگریزی کے مضامین کئی دفعہ دیکھنے میں آئے۔ بہت سلجھے ہوئے اور پرمغز ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ فیض صاحب نے نثر لکھنے کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اور اپنی تمام اعلیٰ قابلیت کے باوجود اب تک

کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کر سکے۔ اور مجھے انجیل مقدس کا وہ قصہ یاد آ جاتا ہے کہ ایک آقا جب سفر پر جانے لگا تو اپنے تین غلاموں کو ایک ایک سونے کا سکہ دے گیا۔ ایک غلام نے اسے خرچ کر ڈالا۔ دوسرے نے اسے زمین میں گاڑ کر دیا اور تیسرے نے اسے کاروبار میں لگا دیا۔ آقا نے سفر سے واپس آ کر پوچھا کہ تم نے مکے کا کیا کیا؟ پہلے غلام نے کہا: "میں نے اسے خرچ کر دیا۔" آقا اس پر بہت بگڑا اور اسے سزا دی۔ دوسرے نے کہا: "میں نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ یہ لیجیے یہ موجود ہے۔" آقا اس سے بھی ناخوش ہوا اور بولا کہ "تم نے اسے ضائع نہیں کیا مگر تم نے اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ یہ تم نے بہت بُرا کیا؟" تیسرے نے سکہ بھی پیش کر دیا اور وہ منافع بھی ہو کاروبار میں اسے لگانے سے حاصل ہوا تھا۔ آقا اس سے بہت خوش ہوا۔ اس کی ستائش کی اور اسے انعام بھی دیا۔ کاش فیض صاحب بھی اپنے ٹیلنٹ کو بروئے کار لاتے اور دوسروں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیتے۔ سنا ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعہ چند مضامین کا کبھی شائع ہوا تھا۔ اب تو وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اور اکثر لوگوں کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کی ادارت بھی فیض صاحب ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بڑا شان دار ہفتہ وار پرچہ "لیبل و منہار" بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کے ادارے سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے مگر ان کا نام شاید برائے نام ہی دے دیا گیا تھا۔ لیبل و منہار میں نہ تو فیض صاحب بالالتزام کچھ لکھتے تھے اور نہ انہیں اس پرچے کے دفتر میں کبھی کام کرتے دیکھا۔ ایک اور معروف ادیب و صحافی تھے سبط حسن، جو اس پرچے کا سارا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سبط حسن کو علیحدہ کر دیا گیا، شاید اس وجہ سے کہ وہ کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے۔ "لیبل و منہار" جس تیزی سے بڑھا تھا، ان کی علیحدگی کے بعد اسی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر صوفی تبسم نے اسے بہت سنبھالنے کی کوشش کی مگر ان کا وقفہ ادارت "لیبل و منہار" کا سنبھالا ہی ثابت ہوا، اور ایک لائق فخر ہفتہ وار جریدہ موت کی آغوش میں جا سویا۔

فیض صاحب بھی کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے مگر ان کی تخریبی سرگرمیاں کبھی دیکھنے

میں نہیں آئیں۔ وہ تو ایک خاموش اور سرجانِ مرنج فنم کے آدمی تھے اور ہیں۔ کمیونسٹ ہونے کا کلنک کا ٹیکہ اگر ایک دفتر کسی کو لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر چھٹائے نہیں چھوٹتا۔ غالباً اسی "داغ بدنامی" کی وجہ سے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" سے، احمد نایم قاسمی "امروز" سے اور سید حسن "لیل و نہار" سے علیحدہ کر دیے گئے۔

جب راولپنڈی کا انسپریسی کیس میں بعض بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے تو میری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شریف آدمی اس نرغے میں کیسے آگیا؟ یہ کوئی بہت اونچے درجے کی سیاست ہے جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لہذا ہم نے

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

کہہ کر صبر کر لیا۔ غالباً تین ساڑھے تین سال تک فیض صاحب قید و بند میں رہے۔ اُس زمانہ میں اُن کی بیگم نے سردانہ دارِ اہتر حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت کی اور اپنی بچیوں کے مدیارت زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جاری رہی اور ان کے اگلے خرچ بھی چلتے رہے۔ میں نے بیگم فیض کو اخبار کے دفتر میں پینے میں شراہور نہایت اہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جا کر انھیں اس حوصلے کی داد دیتا۔ دُور سے انھیں دیکھا اور بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ پارے یہ ابتلا کا دور بھی ختم ہو گیا اور فیض صاحب برہمی ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہوا ہوا نہ ہوا ہو، ہمیں یہ ہوا کہ ان کی منظومات کے دو مجموعے "زندانِ نامہ" اور "دستِ صبا" ہمیں مل گئے۔

بے روزگاری کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے سکرانے وغیرہ لکھے تھے اور اس پر بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ مگر فلم سازی اور فلم بازی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروسکار؟ فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی یونیورسٹی نے کوئی پیش کش نہیں کی۔ شاید اہل اختیار ان کے کلنک کے ٹیکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی شاخ قائم ہوئی تو فیض صاحب اس کے سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھیں لینن پرائز

دینے کا اعلان روس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کی کتاب ڈاکٹریز یو اگو پر نوبل پرائز دیے جانے کا اعلان ہوا تھا اور حکومتِ روس نے اس بوڑھے مصنف کی آدر کئے سے بدتر کر دی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منبع سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا! سب نے دم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے، دیکھیے اب کیا گل کھلتا ہے؟ مگر حکومتِ پاکستان نے اس غیر ملکی اعزاز پر روس کی طرح تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ جب فیض صاحب انعام لینے کے لیے روس جانے لگے تو کراچی ٹھہرتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے اس کونسل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس جلسے کی صدارت کافر مجھے حاصل ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام یا اعزاز نہیں ملا۔ اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے ملک نے انھیں امن کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے ملک میں زندہ ادیبوں کی قدر دانی کا دستور نہیں ہے جیسی تو پاکستان کا سب سے ہر دل عزیز شاعر محروم التفات ہے۔ مگر فیض صاحب نے قیام امن کے لیے جو جدوجہد کی، اس کا علم ہمیں نہ ہو سکا۔

جب فیض صاحب روس روانہ ہو گئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہو گئی کہ واپس آتے ہی وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا اور فیض صاحب شاد و باامراد واپس آ گئے۔ روس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد سنا کہ فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں اور پاکستانی پکھر پر مواد جمع کر کے کتاب لکھیں گے۔ طویل عرصے تک وہ لندن میں رہے اور یہاں واپس آ کر بھی انھیں خاصی مدت گزر گئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شاعرانہ سہل انگاری مانع ہے، یا شاید ویرا آید و دست آید۔ سال ڈیڑھ سال پہلے سنا تھا کہ فیض صاحب کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ بنائے جا رہے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہوئی تھی کہ یہ جگہ ان کے لیے موزوں بھی تھی اور خود یونیورسٹی کے لیے بھی لائق فخر، مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی اربابِ بست و کشاد نے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جو ہر قابل ہوتے ہیں انھیں قدردان مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے مشاہیرے پر ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے فیض صاحب تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے، پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آ گئے۔ حق بہ حق دار رسید۔

مولانا صلاح الدین احمد

(۱)

سینس ٹینٹیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ میں ایک دفعہ لاہور گیا تو منصور احمد مرحوم سے ملنے کمرشل بلڈنگ، مال روڈ پر گیا۔ منصور احمد اس وقت "ہمایوں" کی ادارت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے "ادبی دنیا" لے چکے تھے۔ "ہمایوں" کی تمام تر ادارتی ذمہ داری مولانا حامد علی خاں نے سنبھال لی تھی۔ مولانا تاجور نے ۱۹۲۹ء میں بڑے سائز پر "ادبی دنیا" شائع کر کے ادبی رسائل میں دھوم مچادی تھی۔ یہ زمانہ "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" کے شباب کا زمانہ تھا۔ مگر "ادبی دنیا" اس شان سے نکلا کہ ان جیسے جمائے پرچوں کے پوراغ جھلملانے لگے۔ "ادبی دنیا" کے ادارے میں پہلا نام مولانا تاجور کا تھا اور دوسرا پنڈت میلاد رام وقت کا (جو عرف عام میں طوطا رام بے وفا کہلاتے تھے) مولانا تاجور "ادبی دنیا" کے اجراء سے پہلے "مخزن" اور "ہمایوں" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ لہذا منجھے ہوئے ایڈیٹر تھے اور ان کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ "ادبی دنیا" نکلا اور دو ایک چھلانگیں لگا کر سب سے آگے نکل گیا۔ مگر جو بہت تیز دوڑتے ہیں، وہ بانپ بھی جلدی جاتے ہیں۔ "ادبی دنیا" کے عروج کا زمانہ طول نہ پکڑ سکا۔ مولانا تاجور ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے۔ اور ایک بہت بڑے ناچر کتب عطر حیدر کپور کے ہاں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کا کام بھی کرتے تھے۔ "ادبی دنیا" کا کام انہوں نے میلاد رام وقت اور دو ایک ادھ کچرے ادیبوں پر چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ پرچہ گرنے لگا تو تاجور صاحب نے

منصور احمد سے اس کا سودا کر لیا۔ منصور احمد مرحوم صرف ایڈیٹر ہی نہیں تھے، ادیب بھی تھے۔ اور اچھی شہرت کے ادیب تھے۔ انہوں نے "ادبی دنیا" کی ڈوبتی ناؤ کو پھرتیرا دیا۔ بلکہ پرچے کی سنجیدگی اور بردباری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میری مرحوم سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ دھان پان سے خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ یہیں ایک اور صاحب کو بھی دیکھا جو منصور احمد کے دوست اور رفیقِ کار تھے۔ ان کا نام صلاح الدین احمد تھا۔ یہ صاحب ایک اور پرچہ بھی نکالتے تھے، یاد نہیں رہا اس کا کیا نام تھا۔ نام اس کا بھی "دُنیا ہی پر تھا۔ پرچہ غیر معروف، ایڈیٹر غیر معروف۔ اس لیے علیک سلیک کے علاوہ ان سے اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ بات منصور احمد سے بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ مگر اس مختصر ملاقات نے بھی منصور احمد کے لیے میرے دل میں جگہ بنا دی۔ اور کچھ ہی دنوں میں مجھے ان سے اس درجہ شیفتگی ہو گئی کہ میں نے ان کے نام پر اپنے ایک بچے کا نام منصور احمد رکھا۔ انہوں نے "ادبی دنیا" کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ مگر انہیں زمانے کی نظر لگ گئی اور یہ منحوس نمبر سننے میں آئی کہ منصور احمد کو دق ہو گئی۔ اس زمانے میں اس مؤذی مرض کا کوئی علاج نہیں تھا۔ منصور احمد گھل گھل کر مر گئے۔ اور "ادبی دنیا" بھی ان کے ساتھ دم توڑنے لگا۔

عجب اتفاق ہے کہ میرا لڑکا منصور احمد بھی ایک سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر سنا کہ اشتہادات کی ایک کمپنی نے "ادبی دنیا" کو لے لیا، اور صلاح الدین احمد کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا ہے۔ پرچہ اسی آن بان سے شائع ہونے لگا۔

صلاح الدین احمد صاحب اس وقت تک بالکل گم نام تھے۔ مگر ان کا سلیقہ، پرچے کی ترتیب و تہذیب سے ٹپکتا تھا۔ انہوں نے اپنی مدد کے لیے میرا آجی کو شریکِ ادارت کر لیا تھا۔ کچھ تو اپنے عجیب و غریب نام کی وجہ سے اور کچھ اپنی عجیب تر منظومات کے باعث میرا آجی شہرت کے پر لگا کر اڑنے لگے۔ صلاح الدین احمد حصّہ نثر کی نگرانی کرتے تھے اور میرا آجی حصّہ نظم کی۔ میرا آجی پھر بہت اچھی نثر بھی لکھنے لگے تھے، مگر صلاح الدین احمد صرف ادارتی نوٹ لکھتے تھے۔ ساہا سال تک انہوں نے کوئی مضمون نہیں لکھا۔

مجھے جو عقیدت "ادبی دنیا" سے تھی، وہ جاری رہی اور میں "ادبی دنیا" کے اشتہار

”ساقی“ میں شائع کرتا رہا۔ اور طلب کرنے پر بھی تبادلہ میں ساقی کا اشتہار نہیں بھیجتا تھا۔ اور
 ”جرب“ ”ادبی دنیا“ کے کسی خاص نمبر پر ریویو لکھتا یا اس کا تذکرہ کرتا تو اسے ”اردو کا سب سے
 بڑا رسالہ“ کہتا تھا۔ پھر میں نے ”ادبی دنیا“ کے لیے مضامین بھی لکھنے شروع کر دیے تھے۔
 اس دور میں جو میں لاہور گیا تو ”ادبی دنیا“ کے دفتر بھی پہنچا۔ دفتر سال روڈ ہی پر اور آگے
 منتقل ہو گیا تھا۔ جرب صلاح الدین احمد سے ملاقات ہوئی تو بڑی محبت سے گلے ملے اور ان کی
 گفتگو کا آغاز میری توصیف سے ہوا۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا اور صلاح الدین احمد صاحب مسکراتے
 اور ہنستے جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ”صاحب، آپ ”ادبی دنیا“ کے اشتہارات شائع کر دیتے
 ہیں اور ہمیں اپنا اشتہار نہیں بھیجنے۔ آپ ہمارے لیے مضامین لکھتے ہیں اور معاوضہ نہیں لیتے۔
 عجیب بات ہے۔“ یہ کہہ کر مختصر ہنسی ہنستے۔ میں ٹالنے کے لیے ”چوں کہ چناں چہ“ کی باتیں کرتا مگر
 وہ خندہ دندان نما کے ساتھ موضوع کو بدلنے نہ دیتے۔ دراصل اس زمانے میں لاہور سے ایک
 سے ایک بڑھ کر رسالہ شائع ہو رہا تھا۔ ”ہمایوں“، ”نیرنگ خیال“، ”عالمگیر“، ”خیالستان“،
 ”شاہکار“۔ سبھی باون گزے تھے۔ جتنے یہ بڑے تھے، اتنی ہی ان میں بڑی رقابتیں تھیں۔
 ”دنیا“ ادب میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بنائی تھیں۔ ان ریاستوں میں باہمی
 خوش گواری نہیں تھی بلکہ تناہنی یا بے تعلقی رہتی تھی۔ ہر رسالے نے اپنے مضمون نگاروں کا
 ایک مخصوص حلقہ بنا رکھا تھا۔ ایک رسالے کے مضمون نگار عموماً دوسرے رسالے میں نہیں
 لکھتے تھے، یا شاید مدیروں نے اپنے مضمون نگاروں سے حلف و فاداری لے رکھا تھا کہ کسی
 اور پرچے میں نہیں لکھیں گے۔ چناں چہ سالک، امتیاز علی ناچ، پطرس، تاثیر، ایم اسلم،
 قاضی عبدالغفار اور حفیظ جالندھری ”نیرنگ خیال“ ہی میں لکھا کرتے تھے۔ صلاح الدین احمد
 صاحب کی خوش مزاجی اور سلیقہ شعاری۔ نے بھی اپنے گرد نئے اور اچھے ادیبوں کا ایک
 حلقہ بنا لیا تھا۔ ان میں کرن چندر، بیدی، عاشق بٹالوی، اوپندر ناتھ اشک، حفیظ
 ہوشیار پوری اور حلقہ ادیب ذوق کے اُبھرتے ہوئے ادیب اور شاعر شریک تھے۔
 ”ہمایوں“ کے لکھنے والوں میں فلک پیمیا، نیرنگ، آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی،
 اور قیاض محمود تھے۔ خود میاں بشیر احمد سوائے اپنے پرچے کے کسی اور پرچے میں نہیں لکھتے

تھے۔ یوں لاہور چھوٹے چھوٹے ادبی جزیروں میں بنا ہوا تھا۔ ایک رسالے کا اشتہار بالعموم دوسرے رسالے میں نہیں چھاپا جاتا تھا اور نہ کسی تقریب میں دوسرے حلقے کے ادیبوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں دہلی سے "ساقی" نکلا تو بڑی جدوجہد اور کش مکش کے بعد اس نے ان سب حلقوں سے تعلقات استوار کیے۔ بے تعلقی کے حصاروں میں رہنے ڈالے۔ دوسرے پرپوں کے اشتہارات بھی شائع کیے اور بلا امتیاز ان پرپوں کے لیے مضامین بھی لکھے۔ اس روش پر صلاح الدین احمد کو بڑا اچھا ہوا اور اسی لیے وہ ٹوٹ کر ملے، اور اس ملاقات کے بعد حلقے اور حصار بھی رفتہ رفتہ ٹوٹ گئے۔

صلاح الدین احمد صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراہٹے رہتے تھے اور باتیں کرنے میں بھی مسکراتے جاتے تھے۔ دُہرے ڈیل ڈول کے بھاری بھر کم آدمی تھے۔ بمبئی والوں کی سی کالی کرسی کیپ، ہنستی پیشانی، غلامی آنکھیں خوش دلی سے نیم وا۔ کنار اسی ناک۔ کترواں مونچھیں۔ لبوں پر خلوص کی مسکراہٹ۔ گول چہرہ۔ کھلتا ہوا رنگ۔ اچھا نکلتا ہوا قد۔ سوٹ پہنتے تھے۔ تھے تو گریجویٹ، مگر انھیں انگریزی بولتے نہیں سنا۔ بلکہ گفتگو میں بھی کیا مجال جو کوئی انگریزی لفظ آجائے۔ اُردو کے عاشق تھے۔ اپنے رسالے میں برابر اعلان کرتے رہتے۔ اُردو پڑھو۔ اُردو لکھو۔ اُردو بولو۔ یوں تو پنجاب کے کبھی ادیب اُردو کے فدائی ہیں۔ اور زبان کے معاملے میں اہل زبان سے بھی اچھے سلجھتے رہتے ہیں۔ مگر میں نے یہ تماشنا بھی بہت دیکھا ہے کہ جب اُردو کے دو پنجابی ادیب آپس میں ملتے ہیں، تو بلا تکلف اُردو کو بالائے طاق رکھ کر فوراً پنجابی میں بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا، علامہ اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مگر ایک تو صلاح الدین احمد اور دوسرے حامد علی خاں، دو ادیب ایسے دیکھے جو پنجاب کے معزز خانوادوں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اُردو ہی بولا کرتے تھے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے گھروں میں بھی اُردو ہی بولی جاتی تھی۔ جبھی تو ان کی زبان بھی چینی نہیں کھاتی تھی، اور اہل زبان کی طرح فوراً اُردو بولنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ مجھے ان کی خوش گفتاری پر رشک آنے لگا تھا۔ لکھنے کو تو سیکڑوں اکتسابی زبان والے اچھی سے اچھی زبان لکھ لیتے ہیں، مگر بولنا ٹیڑھی کھیر ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد وضع قطع سے تو بالکل ایک آپ ٹوڈیٹ جڈٹلین دکھائی دیتے تھے مگر کہلاتے "مولانا" تھے۔ سب انہیں مولانا کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے اور حجب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے بھی مولانا کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ میں نے دل میں کہا۔ "ولی را ولی می شناسد، شاید میں بھی مولانا ہی ہوں۔" لہذا آخری ملاقات تک "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" پر ہمارا عمل رہا۔ وہ مجھے مولانا کہتے رہے اور میں انہیں مولانا کہتا رہا۔

پہلی ملاقات کے دوسرے دن شام کو مولانا نے اپنے دفتر میں میرے اعزاز میں پرتکلف عصرانہ کا اہتمام کیا۔ اس میں اپنے تمام مقامی لکھنے والوں کو بلایا۔ اور سب سے مجھے منعارف کرایا۔ مولانا کے اس خلوص نے مجھے اور بھی ان کا گرویدہ کر دیا۔ اسی پارٹی میں کرنشن چندر، بیدی، اشک، شیر محمد اختر، عاشق بٹالوی اور کئی اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے تعلق خاطر قائم ہوا۔ اس واقعہ سے میری تو عزت افزائی ہوئی ہی مگر مولانا کی وسیع القلمی بھی ظاہر ہوئی۔ ورنہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ رسالوں کے ایڈیٹر اپنے مخصوص لکھنے والوں سے بالمشافہ ملوانا تو کیسا، ان کے پتے تک نہیں بتاتے تھے۔

مولانا ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اگر کسی مضمون میں ذرا بھی فحش کا نشائبہ ہوتا یا عربی کی جھلک ہوتی تو اسے شائع نہ کرتے۔ اس وضع احتیاط میں پہلا نمبر "بہایوں" کا تھا کہ بوسے کا لفظ "بہایوں" میں نہیں چھپ سکتا تھا۔ مولانا اتنے متشدد تو نہیں تھے لیکن کچھ زیادہ ہی محتاط تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادیبوں کو کھل کھیلنے کی راہ سجدی مٹھی۔ "انگارے" کیا ضبط ہوئی کہ اس نے اور آگ لگا دی۔ اور اسی طرز کے افسانے لکھنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ جنسی معاملات کو تفصیل سے بیان کرنا ترقی پسندی کی علامت ٹھہری لہذا نئے لکھنے والے تو سب بہک کر اُدھر ہی کو ڈھل گئے۔ بہت کم ادیب ایسے رہ گئے جنہوں نے سلامت روی کی چال نہیں چھوڑی۔ یہی وہ افراتفری کا زمانہ تھا کہ مولانا نے کرنشن چندر اور بیدی جیسے ادیبوں کو دریافت کیا۔ اور ان سے مضامین لکھوا لکھوا کر انہیں بھاری بھر کم ادیب بنا دیا۔ مولانا ساہا سال تک ادبی دنیا شائع کرتے رہے۔

مگر انھوں نے سوائے ادارتی نوٹوں کے نہ تو اپنے رسالے میں کوئی قابل ذکر مضمون لکھا اور نہ کسی اور رسالے میں۔ دو چار کتابوں کے پیش لفظ انھوں نے ضرور لکھے تھے، جن میں سے ایک ان کے عزیز دوست عاشق بٹالوی کے افسانوں کے مجموعے "شناخسار" پر تھا اور ایک عصمت چغتائی کے افسانوں کے مجموعے "کلیاں" پر۔ انھنی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر بھی گہری ہے اور عبارت بھی سلیس اور رواں لکھتے ہیں۔ مولانا اس وقت تک ادیب سے زیادہ ادیب گر تھے۔ پھر قیام پاکستان سے چند سال پہلے انھوں نے "کہنے کی باتیں" کے عنوان سے رسالوں کے بعض مضمون کے بارے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ گویا جدید ترین ادب کا جائزہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں آگے چل کر انھوں نے "ساتی" کے ایک مضمون پر کڑی تنقید کی، جو مجھے اس لیے ناگوار گزری کہ میں اتنا ثقہ مذاق نہیں رکھتا تھا جتنا کہ مولانا، یا میں اتنا محتاط نہیں تھا جتنے کہ مولانا۔ میں نے ساتی میں اس کا جواب لکھا اور شروع اس فقرے سے کیا کہ مولانا جو "کہنے کی باتیں" پر مہینے لکھتے ہیں، وہ دراصل "نہ کہنے کی باتیں" ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں میں کسی قدر بد لحاظی بھی کر گیا تھا۔ مولانا بڑے طرف کے آدمی تھے۔ مجھے فوراً معذرت کا خط لکھا اور لکھا کہ آج سے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔ مجھے اپنی بد تمیزی پر افسوس ہوا اور میں نے مولانا سے معافی چاہی۔ مگر "کہنے کی باتیں" پھر نہیں چھپیں۔ اور جب اس واقعہ کے بعد مولانا سے ملاقات ہوئی تو ان کے طرزِ تپاک میں کوئی فرق میں نے محسوس نہیں کیا۔ ان خورداں خطا و از بزرگان عطا۔" مولانا مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ مجھ پر آخر تک شفقت فرماتے رہے۔ جب دہلی سے اُجرہ کر میں ستمبر ۱۹۴۷ء کے تیسرے ہفتے میں لاہور پہنچا تو اپنی ادبی برادری والوں سے ملنے کی جستجو ہوئی معلوم ہوا کہ مولانا کا گھر ہندوؤں کے محلے میں تھا۔ جب اس محلے میں آگ لگی تو ان کا گھر بھی جل گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مولانا کے لواحقین سب شملہ میں تھے ورنہ اس آتش زدگی میں خبر نہیں، ان پر کیا گزرتی؟ مگر وہ سب کے سب شملہ میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مولانا بے حد پریشان تھے۔ مگر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ ان کے مال پر طلی۔ جانیں سب کی بچ گئیں۔ مکان جل گیا تھا۔ گھر والے شملہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ "ادبی دنیا" بند ہو گیا تھا، مگر مولانا کے اندازِ تکلم میں مسکراہٹ اس وقت بھی شامل تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا کی حیثیت ایک اچھے ایڈیٹر اور صاحبِ نظر نقاد کی تھی۔ ادیب یا مصنف یا تو انہوں نے بنتا نہیں چاہا یا شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ اس میدان میں سب آئیں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ وہ صفِ اول کے ایڈیٹر تھے، غالباً انہوں نے پسند نہیں کیا کہ تیسری یا دوسری صف کے ادیبوں میں ان کا شمار ہو۔ کیوں کہ ایک دفعہ ساکھ بگڑ جانے کے بعد اس کا سنورنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو ادیب زیادہ لکھتا ہو، وہ اچھا بھی لکھتا ہو۔ مولانا نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے یا حصولِ شہرت کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ اور جب وہ اس میدان میں آئے تو اس شان کے ساتھ کہ سب سے باہمی لے گئے۔ اُس وقت وہ پچاس کے پیٹے میں آچکے تھے۔ گویا ان کے شہد سے ان کے فلم کا شباب شروع ہوا۔ مگر جس منزل تک پہنچنے کے لیے ادیب ساری ساری عمر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور پھر بھی نہیں پہنچ پاتے، مولانا نے ایک ہی جست میں اس منزل کو جالیا۔

اب جو مولانا ہمارے سامنے آئے تو ان کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نہایت حسین و دل نشین طرزِ بیان لائے تھے۔ اس اندازِ نگل فشرانی پر شمس العلماء محمد حسین آزاد کا سایہ تھا۔ مولانا کو پروفیسر آزاد کی تحریروں سے والہانہ شیفٹنگی تھی۔ اور ہونی بھی چاہیے تھی، کیوں کہ آج بھی اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز آزاد ہی ہیں۔ مگر آزاد کی مرصع کاری کی پیروی کرنا جوڑے شیر کا لانا ہے۔ اس صدی میں تو کسی کو حوصلہ ہوا نہیں۔ آزاد کی برسوں ہر سال ان کے پوتے آغا محمد باقر لاہور میں مناتے ہیں اور ہر برس ہی، مولانا صلاح الدین احمد، آزاد کے کسی نہ کسی پہلو پر آزاد ہی کے انداز میں مضمون لکھ کر سناتے رہے ہیں۔ یوں آزاد کا طرزِ تحریر مولانا کے کھٹ میں اُتر گیا اور اس میں مولانا نے اپنے قلب و نظر کی خاص و دلچسپیں شامل کر کے اپنا ایک خوش رنگ و خوش آہنگ اسلوب مرتب کر لیا۔ اس مد میں مولانا نے جو کچھ لکھا، انہوں سے لگانے اور دل میں سمالنے کے لائق ہے۔ اب سے کوئی دس سال پہلے پاکستان کے ادبی رسائل کی بے قدری و زیوں حالی کے پیش نظر جب مولانا رازق الجیری اور میں نے مل کر انجمن ادبی رسائل پاکستان کی داغ بیل ڈالی تو

پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو ہم نے انجمن کا تمبر بنا لیا اور سب نے رکنیت اس لیے فوراً قبول کر لی کہ ہم سب کے مسائل ایک سے تھے۔ مگر مولانا صلاح الدین احمد نے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اس پر ہمیں تعجب بھی ہوا۔ خیر چند مہینے بعد انجمن کی مجلسِ عاملہ نے طے کیا کہ اس کا باقاعدہ افتتاحی جلسہ لاہور میں کیا جائے۔ لہذا ہم نے چندہ کیا اور بارہ ایڈیٹر لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ہمارے مٹھرنے اور جلسے کا انتظام لاہور کے ادبی رسائل کے ایڈیٹروں نے کیا تھا۔ ان میں پیش پیش ”نفوس“ کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب تھے۔ شام کو مہمان اور میزبان سب ایک جگہ جمع ہوئے اور جلسے کی تفصیلات طے کی گئیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح میں اور مولانا رازق الخیر مولانا صلاح الدین احمد کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ کتھی کھٹکھٹائی، جواب نہ ارد۔ پھر کھٹکھٹائی، دُور سے آواز آئی۔ ”ذرا مٹھرو“ مٹھر گئے۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو صلاح الدین احمد صاحب گھبرائے ہوئے برآمد ہوئے اور ہمیں دیکھ کر اور بھی گھبرائے۔ ان کا سر اور دھڑپانی میں تڑپتھا۔ صرف پاجامہ پہنے ازار بند باندھتے چلے آئے تھے۔ جھجک کر بولے۔ ”آپ حضرات ہیں یا میں سمجھا، دودھ والا ہے۔ معاف فرمائیے، ابھی حاضر ہوا۔“ اور مولانا بغلی ڈوب کر غائب ہو گئے۔ ہم اپنی جگہ پر نشر مندہ ہو رہے تھے کہ ایک تشریف آدمی کے گھر صبح ہی صبح کیوں بے اطلاع جا دھکے۔ اتنی دیر میں مولانا کرنا نہیں کر آگئے اور بولے۔ ”آئیے، اندر تشریف لائیے“ پہلو میں ایک کمرہ تھا، جس میں امخوں نے ہمیں بٹھایا اور ناشتہ کو پوچھا۔ ہم نے کہا۔ ”ناشتہ سے ہم قانع ہو چکے ہیں۔ آپ سے دو باتیں کرنی تھیں اس لیے حاضر ہو گئے۔“ بولے۔ ”فرمائیے۔“ خیر ہی صاحب نے کہا۔ ”ایک تو یہ بتائیے کہ آپ انجمن کے ممبر کیوں نہیں بنے؟ اور دوسرے یہ کہ آپ ہمارے جلسے میں تشریف کیوں نہیں ہو رہے؟“ مولانا نے چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر کہا۔ ”مولانا! میں کسی انجمن کا تمبر نہیں بنتا۔ ویسے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ دیکھیے میں نے جلسے کے لیے دو ریزولوشن لکھے ہیں جو میرے ہی نام سے پیش کیے جائیں گے۔“

ہم نے مولانا سے مزید سوالات کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ مولانا بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے تھے۔ اور پھر اپنے فیصلے پر جم جاتے تھے۔ ہمیں جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا،

اس لیے اس مختصر سی ملاقات کے بعد ہم نے مولانا سے اجازت چاہی۔
مولانا بہت ہی خوددار آدمی تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ جو انجمن بنی ہے، اس لیے
ہی ہے کہ ادبی رسائل کے حقوق کے تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے کچھ سرکاری امداد ملنے
لگے۔ اور جب اسے امداد ملنے لگے گی تو آگے چل کر اس میں جھگڑے بھی بہت پڑیں گے مولانا
دن گئے فساد سے دُور رہتے تھے۔ اپنی ۳۵ سالہ ادبی زندگی میں وہ ایک دفعہ بھی کسی سے نہیں
اُلجھے۔ خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے تھے۔ سرکاری امداد قبول کرنے کے وہ سخت مخالفت
تھے۔ جب انھوں نے پنجاب اکیڈمی بنائی تو انھیں بڑی آسانی سے پچیس تیس ہزار روپے سالانہ
کی سرکاری امداد مل سکتی تھی۔ مگر وہ اپنا گھر لٹاتے رہے اور انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی
کسی سے بطور امداد قبول نہیں کیا۔ مولانا اپنے منصوبے خود بناتے تھے اور انھیں اپنی ہی
مرضی سے پورا کرتے تھے۔ کسی طرف سے دخل در معقولات وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ دو
ایک سال ہوئے کہ انھوں نے ایک ادارے اُردو فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی تھی اور بڑے
پیمانے پر اُردو مطبوعات کا کام کرنا چاہتے تھے۔ اور یقیناً وہ ان تمام اداروں سے کہیں زیادہ
اور بہتر کام کرتے جنھیں لاکھوں روپے سالانہ کی امداد حکومت سے مل رہی تھی۔ انجمن ادبی
رسائل پاکستان نے حکومت سے سالانہ امداد حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ کیوں کہ
اس انجمن کا کام صرف ادبی رسائل کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔
اگر کچھ خرچ ہوتا بھی ہے تو اس کے اراکین خود ہی اخراجات کو پورا کر لینے ہیں مگر مولانا کی
حد سے بڑھی ہوئی احتیاط نے اس پر بھی انھیں رکنیت قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور
یہ بھی واقعہ ہے کہ جب دو سال پہلے انجمن کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا تو اس کی ایک نشست
میں، جس کی صدارت جسٹس جان نے کی تھی، مولانا نے ایک نہایت پُر مفرز اور دلادیز مضمون
پڑھا تھا۔ یوں انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ ممبر نہ ہونے کے باوجود وہ ہمارے شریک رہے۔
انجمن کسی سال سے اس کوشش میں ہے کہ بعض ان مدیران رسائل کے وظائف مقرر
ہو جائیں جنھوں نے ساری عمر خدمتِ ادب میں گزار دی اور اب ان کی صحت بھی خوب
دے رہی ہے اور مالی حالت بھی اچھی نہیں رہی ہے۔ جتنی بھی حکومتیں اب تک پاکستان میں

برسر اقتدار آئیں، ان کے ڈزرا اور وزارت کے سیکرٹریوں کی خدمت میں انجمن کے وفد حاضر ہو کر محضر پیش کرتے رہے مگر عجب اتفاق ہے جب کام بننے پر آیا تو حلو مرت بدل گئی۔ جن محترم مدیروں کے لیے جد و جہد و بہہر کی جا رہی ہے ان میں سے بلا استثنیٰ سبھی نے شرط لگائی ہے کہ یہ وظائف بطور خیرات قبول نہیں کیے جائیں گے، بلکہ انہیں اگر حسن خدمات کا صلہ موسوم کیا جائے گا تو قابل قبول ہوں گے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ حکومت ہمارا ہی اپنی ہے، کسی غیر ملک کی نہیں ہے۔ مگر وظائف کی فہرست میں جب مولانا کا نام شامل کرنے کی اجازت چاہی گئی تو وہ اس قدر گھبرائے اور برہم ہوئے جیسے ان سے خطِ غلامی لکھوایا جا رہا ہو۔ بولے۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرا نام سرگزشت پیش نہ کریں۔ میں نے آج تک کسی قسم کی سرکاری امداد قبول نہیں کی ہے۔ مجھے معاف رکھا جائے۔"

میں تو مولانا کی طبیعت سے کسی قدر واقف تھا اس لیے ان کی برہمی پر متعجب نہیں ہوا، مگر انجمن کے صدر مولانا رازق الخیری حیرت اور شرمندگی سے ان کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا اس تجویز کو سن کر خوش ہو جائیں گے۔ مگر وہاں اُلٹی آنتیں گھلے پڑ گئیں۔ قدری کر لی مگر مولانا قابل نہیں ہوئے، اور ہم اپنا سامنہ لے کر ان کے دفتر سے چلے آئے۔ مولانا رازق الخیری نے زینے سے اترنے کے بعد خالص دلی والوں کے لہجے میں کہا: "بس مہٹی، کہہ چکے؟" میں نے کہا: "جی ہاں! یہ طائرِ لاہوتی ہے۔"

قیامِ پاکستان کے بعد اردو کے فدائی لاہور میں گنتی کے رہ گئے تھے، ان میں سے بھی نئے حالات نے بہت سوں کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان شکست خوردہ ادیبوں میں سالک، مہر اور امتیاز علی تاج جیسے قد آور لوگ بھی شریک تھے۔ سالک اور مہر نے اخبار "انقلاب" بند کر کے کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ تاج صاحب تہذیب نسواں اور "پھول" سے کنارہ کر کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے تھے، اور بعد میں کچھ اور سرکاری کاموں میں مبتلا ہو گئے۔ میاں بشیر احمد نے پے در پے کئی ایڈیٹر دیے مگر "ہمالیوں" کا معیار بھی گرنا گیا اور اشاعت بھی، یہاں تک کہ مایوس ہو کر انہوں نے "ہمالیوں" بند کر دیا۔

حامد علی خاں صاحب نے "الحمد" جاری کیا تھا، بہت سارا نقصان بھرنے کے بعد بند کرنا پڑا۔ "نیرنگ خیال" کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب اپنا پرچہ لاہور سے پنڈی لے گئے اور جب اس کے چلنے کی کوئی راہ نہ نکلی تو اسے بند کر کے حکمت کے ہو رہے۔ "عالمگیر" کے ایڈیٹر حافظ محمد عالم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے ساتھ ان کا پرچہ بھی سر گیا۔ اس سراسری میں بڑے بڑوں کے جی چھوٹ رہے تھے مگر مولانا صلاح الدین احمد ڈٹے ہوئے تھے۔ جب بھی انھیں موقع ملتا "ادبی دنیا" کا ایک پرچہ چھاپ دیتے۔ یوں کئی سال تک ان کا پرچہ گنڈے دار نکلتا رہا اور اسی افراتفری میں انھوں نے پنجاب اکیڈمی قائم کر کے کتابیں چھاپنی شروع کر دیں۔

مولانا اپنے پرانے رفیق کار "میراجی" کی کتابیں چھاپنا چاہتے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بیسی میں میراجی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور مولانا ان کی یادگار اس طرح قائم کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اسے کتابی صورت میں محفوظ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ میراجی کے مرنے سے ان کی بیوہ نابینا والدہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ مولانا نے مجھے اس سلسلے میں خط لکھا کہ میراجی کی کتابیں چھاپ کر ان کی رائٹنگ ان کی والدہ کو دینا چاہتے ہیں۔ میرے پاس میراجی کی چار کتابوں کے حقوق اشاعت تھے میں نے ان سے دست بردار ہی لکھ کر مولانا کو بھیج دی۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور مجھے طویل خط شکریہ کا لکھا۔ میراجی کے نثری مضامین کا انتخاب مولانا نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں چھاپ دیا تھا۔ افسوس کہ ان کے منظومات کے مجموعے شائع کرنے کی توبت نہ آئی۔

یوں تو مولانا لڑائی بھڑائی سے بہت دور رہتے تھے اور کبھی کسی سے ان کی معاصرانہ چشمک نہیں ہوئی۔ مگر وہ تھے بڑے دبنگ آدمی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ صدر ایوب نے جب پنجابی میں تقریر کی تو مولانا نے انھیں بر ملا ٹوک دیا کہ انھیں قومی زبان اردو میں تقریر کرنی چاہیے تھی۔ اور اس پر بھی توجہ دلائی تھی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سے لفظ اسلامی کیوں ساقط کیا گیا؟

صدر ایوب مولانا کی اس جرات مندانہ تنقید سے ناخوش نہیں ہوئے جیسا کہ ان کے

اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے، جو انہوں نے مولانا کے انتقال پر دیا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ ہم میں سے کتنے ہمت رکھتے ہیں کہ صدر پاکستان کو اس بے باکی سے ٹوک دیں؟

آئینِ جوانِ مردانِ حقِ گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں مولانا کے دل میں یہ سما گئی تھی کہ وہ ۶۳ سال کی عمر میں مرجائیں گے۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ ابنِ انشا صاحب نے کراچی سے اپنے ادارے کا کچھ کام مولانا کو سال ڈیڑھ سال پہلے بھیجا تھا۔ مولانا نے کم فرصتی کا عذر کر کے کام لوٹا دیا تھا اور انشا صاحب کو بتایا کہ چوں کہ ان کے اب و جد ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کرتے رہے ہیں لہذا انہیں بھی ۶۳ سال کی عمر میں مرجانا ہے اور اس عمر کو پہنچنے میں کچھ زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا۔ یہ بات انشا صاحب نے مجھے بتائی تھی، اور جب میں پچھلے سال لاہور گیا تو حامد علی خاں صاحب سے برسِ میلِ تذکرہ مولانا کے اس وہم کا بھی ذکر آیا۔ حامد صاحب نے فرمایا یہ واقعہ صحیح ہے، اسی لیے وہ اپنے تمام کام جلدی جلدی سمیٹ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری پونجی اپنے ادارے "اردو فاؤنڈیشن" کے لیے وقف کر دی تھی۔ اور "ادبی دنیا" کو ایک نئے انداز سے نکالنا شروع کر دیا تھا۔ تین سو صفحے کا پرچہ اب انہوں نے ایک روپے میں دینا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اصولاً اس کی قیمت تین روپے ہونی چاہیے تھی۔ اخبار فروشوں کو کمیشن وغیرہ دینے کے بعد تو آنے کا پڑتا تھا۔ لہذا "ادبی دنیا" کی دھوم مچ گئی اور ہر اشاعت کے بعد اس کی تعداد دگنی ہوتی چلی گئی۔ یعنی نقصان بھی دو گنا ہوتا چلا گیا۔ ہم تو یہ کہتے تھے کہ یہ صریحاً خودکشی ہے۔ مولانا نے موم بتی کو دونوں سروں سے جلا دیا ہے۔ اور مولانا یہ سمجھتے تھے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اسی صورت میں پرچہ خود کفیل ہو جائے گا۔ وہ فرماتے تھے کہ "میں اپنی اولاد کے فرائض سے سبک دوش ہو چکا ہوں۔ میرا ایک مکان اور رہ گیا ہے، میں اسے بھی بیچ کر اس تجربے میں لگا ڈالوں گا۔ ۶۳ سال کی حد اب قریب آچکی ہے۔ اپنے سامنے ہی "ادبی دنیا" کی بنیادیں استوار کر دینا چاہتا ہوں؟ اور اگر مولانا

کو موت فرصت دیتی تو یقیناً وہ اپنے تجربے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مگر ۶۳ سال پورے ہو گئے اور مولانا کا اندیشہ پورا ہوا۔

۱۔ ارجون کو "نقوش" کی سویں اشاعت "آپ بیتی نمبر" کی تقریب میں جیب میں اپنا مضمون پڑھ رہا تھا تو اچانک میری نظر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ سامعین کی دوسری صف میں مولانا بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جیب اپنا مضمون ختم کر کے واپس آیا تو میری جگہ پر کوئی مہربان بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے تقریباً سب سے پیچھے جا کر بیٹھنا پڑا۔ وہاں سے پھر میں نے مولانا کو دیکھا۔ بالکل ویسے ہی تھے جیسے تیس سال پہلے تھے۔ صرف مونچھیں کھڑکی ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ جلسہ ختم ہو گا تو میں مولانا سے لپٹ جاؤں گا۔ مجھے ان سے بے دس سال ہو گئے تھے۔ مگر جب جلسہ ختم ہوا تو اس جلسے کے منتظم عشرت رحمانی صاحب نے مجھے لے جا کر وزیر تعلیم مغربی پاکستان کے پاس بٹھا دیا۔ اور جب میں وہاں سے اٹھا تو مولانا جا چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ کل دفتر جا کر مولانا سے مل لوں گا۔ مگر اگلے دن میں کچھ اور کاموں میں مچنس گیا، اور شام کی گاڑی سے کراچی واپس روانہ ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی مولانا کا آخری دیدار ہے۔ اس کے چوتھے دن ریڈیو نے یہ منہوس خبر سنائی کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔

(۲)

بعض پیارے جو ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، جب ان کا خیال آتا ہے تو دھیان میں دھنک سنی نکل آتی ہے۔ کسی کسی کا تصور بندھتا ہے تو خوشبو سے مشام جیا معطر ہو جاتا ہے، کبھی کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، کبھی پھول کھلنے لگتے ہیں۔ مگر مولانا صلح الدین احمد یاد آتے ہیں تو ذہن کے افق پر چاند کھیت کرتا ہے اور ٹھنڈی چاندنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں مولانا چودھویں کا چاندین کراؤب کے آسمان پر چمکے اور مرے تو اپنے پیچھے ایک ایسی کہکشاں چھوڑ گئے جو ان کے نام کو رہتی دنیا تک پائندہ و تابندہ رکھے گی۔

مولانا کو بچپن ہی سے ادب کی چٹیک تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو اپنے حبیب خیرچ میں سے پیسے بچا کر انھوں نے ایک رسالہ نکالا تھا جس میں خود لکھتے تھے اور اپنے اسکول

کے دوستوں سے لکھواتے تھے۔ جیب پیسے ختم ہو گئے تو رسالہ بھی بند ہو گیا۔ مگر ادب کی لگن باقی رہی اور اس دینی ہوئی خواہش کی تکمیل اُس وقت ہوئی، جب کئی سال بعد مولانا تاجوہ نجیب آبادی سے انھوں نے "ادبی دُنیا" کو خرید لیا۔

مولانا ایک اُسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ یہ خاندان زوالِ دینی کے زمانے میں دلی چھوڑ کر لاہور آ گیا تھا۔ مولانا کے والد مولوی احمد بخش عربی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم اور چیفیس کالج میں فارسی کے استاد تھے۔ مشرقی زبانوں سے انھیں بچپن ہی میں شیفنگی ہو گئی تھی۔ اور خاندان کے پنجاب منتقل ہو جانے کے باوجود ان کے گھر میں اردو ہی بولی جاتی تھی۔ اس خاندان کے افراد ملازمت پدیشہ تھے اور انگریزوں کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ مولانا کے بڑے بھائی ضیاء الدین احمد جو مولانا سے کئی سال بڑے تھے۔ سندھ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ مولانا بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد پولیس سروس میں آجائیں۔ مگر مولانا ملازمت کے بندھنوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی میں اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی برکت دے دی تھی۔ مگر جس کو ادب کی چاٹ لگ جائے، وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ چنانچہ جیب "ادبی دُنیا" کو مولانا تاجوہ نے بند کرنے کا ارادہ کر لیا تو مولانا مرحوم نے اُسے خرید لیا۔ لاہور ہی میں ایک اور صاحب تھے منصور احمد۔ یہ صاحب مولانا کے پرانے ہم جماعت اور دوست تھے۔ ان کا تعلق مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تھا۔ انھیں بھی ادب کا چسکا شروع ہی سے تھا۔ بی، لے پاس کرنے کے بعد "ہمایوں" کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ کئی سال تک "ہمایوں" کو چلانے کے بعد خدائی صورت کی بنا پر "ہمایوں" کی ادارت حامد علی خاں صاحب کو سونپ کر علیحدہ ہو گئے۔ منصور احمد تجربہ کار اور نیک نام ایڈیٹر تھے۔ صلاح الدین احمد صاحب نے اپنے رفیقِ دیرینہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ "ادبی دُنیا" کا بارِ ادارت اٹھانے میں ان کے شریک ہو جائیں۔ صلاح الدین احمد کو اس وقت تک کوئی مہنہ نہیں جانتا تھا۔ منصور احمد کو سب جانتے تھے، اُن کی ساکھ بھی تھی۔ اس سے "ادبی دُنیا" کو دوبارہ جمانے میں بڑی مدد ملی۔ صلاح الدین احمد صاحب اچھے منتظم بھی تھے۔ رسالے کا کام انھوں نے بہت باقاعدگی

سے شروع کیا۔ منصور احمد نے پرچے کی ترتیب اپنے ذمے لے لی۔ ان کے چھوٹے بھائی منظر احمد نے حساب کتاب سنبھالا۔ ایف ایم ساقی نے اشتہارات مہیا کرنے کا ذمہ لیا۔ مولانا بخور کے زمانے میں بھی شعبہ اشتہارات اُمّتی کے سپرد تھا۔ صلاح الدین احمد صاحب نے انتظامیہ شعبہ بھی سنبھالا، اور ادارت میں بھی ہاتھ بٹایا۔ دفتر کے مختلف کام کرنے کے لیے چار اور آدمی رکھے گئے۔ سال روڈ پر دفتر آگیا۔ پرچہ بڑے طمطراق سے نکلنے لگا اور چند مہینوں ہی میں اپنے ہم عصر رسالوں میں مقام پیدا کر لیا۔ ”ادبی دنیا“ سائز میں تمام ادبی پرچوں سے بڑا تھا۔ اور اس کی ظاہری وضع قطع بھی بہت خوش مناسقتی۔ نئے لکھنے والے ادبا اس کے لیے مضامین بھیجتے تھے اور اس میں چھپ جانا اپنے لیے قابلِ فخر بات سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقریباً سارے ہی اچھے لکھنے والے ”ادبی دنیا“ میں جمع ہو گئے۔ اس کھیپ میں میراجی بھی آئے، کرشن چندر، سیدی اور اشک بھی۔ انھیں ”ادبی دنیا“ سے شہرت ملی اور ”ادبی دنیا“ کو ان سے فروغ ملا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی مقناطیسی شخصیت نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ ”ادبی دنیا“ کو مل گیا۔ مولانا ان نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ جتانے رہتے تھے کہ ادب میں پاکیزگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ اور اخلاقی قدروں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ مولانا نے انھیں یہ بھی بتایا کہ اچھی چیزیں لکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے، کہ کلاسیکی ادب سے اپنا تانا نہ توڑا جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ بعض بہت اچھے مضامین محض اس لیے ”ادبی دنیا“ میں جگہ نہ پاسکے کہ ان میں فحاشی یا عبرانی کا بھڑو شامل تھا۔ مولانا اس معاملے میں بہت سخت گیر تھے۔ خوش اسلوبی سے مضامین لوٹا دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ منٹو کا کوئی مضمون ”ادبی دنیا“ میں کبھی چھپا ہو۔

منصور احمد کے مرض نے وق کی صورت اختیار کر لی اور بہت تھوڑے عرصے بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وقت صلاح الدین احمد صاحب کے لیے بڑا آزمائش کا تھا۔ مگر وہ محنتی آدمی تھے، اس صدمے کو جھیل گئے اور منصور احمد کی کمی کو انھوں نے محسوس نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ”ادبی دنیا“ اسی شان سے نکلتا رہا۔

میراجی نے اپنے زمانہ ملازمت میں دوسری زبانوں کے مشہور شعرا پر بہت کام کے

مضامین لکھے۔ بو دلیران کا محبوب و مثالی شاعر تھا۔ اس کی شخصیت کا زیادہ حصہ میراجی نے اپنے کردار میں سمویا تھا۔ جب محمود نظامی نے میراجی کو آل انڈیا ریڈیو میں دلی بلوایا تو مولانا تنہا ادارتی فرائض انجام دینے لگے۔

مولانا بے حد شریف النفس انسان تھے۔ رسالے والوں کی برادری میں اکثر آپس میں جھڑپیں ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر "ادبی دنیا" کبھی کسی لڑائی بھڑائی میں مبتلا نہ ہوا۔ حالانکہ لاہور اس زمانے میں ادبی جدال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا عمید المجید سالک اپنے "افکار و حوادث" میں یوپی والوں سے اُلجھتے سلجھتے رہتے تھے۔ حفیظ جالندھری اور مولانا تاجور کی چلتی رہتی تھی۔ نیار مندان لاہور نے اپنا محاذ بنا رکھا تھا۔ لیکن مولانا ان سب مناقشوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان سب سے الگ رہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ لہذا وہ اپنے سب معاصرین سے بازی لے گئے۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رسائل کے جائزے کے سلسلے میں مولانا نے ساقی کے کسی مضمون پر کچھ لکھ دیا تھا۔ مجھ مولانا کا یہ تھوڑا سا لکھنا بھی بہت بُرا لگا تھا۔ اور میں نے جواب میں کچھ باتیں ایسی لکھ دی تھیں جو گستاخی کی حد کو پہنچ گئی تھیں۔ مولانا نے یہ کیا کہ "ادبی دنیا" میں سے یہ سلسلہ ہی اڑا دیا۔ اور مجھے اس کے منقطع کرنے کی اطلاع دی۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور میں نے فوراً معذرت کا خط لکھا، مگر مولانا نے وہ سلسلہ دوبارہ جاری نہیں کیا۔ اتنا صلح کُل مدیر میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ تھمٹل اور بر دباری مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نئے مضمون نگار ان کے دفتر میں پہنچ کر انھیں بہت ستاتے تھے۔ بعض بحث کرنے لگتے تھے، مگر مولانا کی تیوری پر بل تک نہ آتا تھا۔ بڑی نرمی اور خوش اسلوبی سے ان کے مضامین کے نقائص انھیں سمجھا دیتے تھے، اور انھیں مطمئن کر کے رخصت کرتے تھے بیٹے دل گردے کا کام ہے یہ۔ اپنی تو کیفیت یہ تھی کہ بحث کسی سے نہیں کی۔ بس کہہ دیا کہ مضمون ٹھیک نہیں ہے، نہیں چھپ سکتا۔ اور اگر کسی نے بحث کی تو اسے چیراندی باتیں کر کے بھگا دیا۔

کوئی تیس سال پہلے مولانا سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ کہلاتے مولانا تھے مگر نکلے آپ ٹوڈیٹ جٹلمین۔ پورا سوٹ مرع نکٹائی کے زیب تن تھا۔ سرودر،

کھلی پیشانی، غلاتی آنکھیں، سو اسی ناک، کتر واں مونچھیں، منڈھی ہوئی ڈاڑھی، لبوں پر مسکراہٹ، چہرے پر ذہانت کا نور۔ بڑھی دل کش شخصیت تھی مولانا کی۔ اس پر ان کا حسن اخلاق سونے پر سہاگہ۔ مجھ سے پانچ چھ سال بڑے تھے۔ مگر پہلی ملاقات میں ہم عمروں کی طرح گھل مل گئے۔ مولانا کی وضع مغربی تھی مگر ان کا دل خالصتاً مشرقی تھا۔ بہت خوش ہوئے اور بہت خوش کیا۔ اگلے دن شام کو دفتر ہی میں چائے پر بلایا تو ادبی دنیا کے تقریباً سبھی مقامی مضمون نگار موجود تھے۔ اکثر سے ملاقات پہلے ہو چکی تھی۔ کرشن چندر، بیدی، اشک، عاشق بٹالوی، اور دیوندر ستیا رتھی سے یہیں تعارف ہوا۔ اس واقعہ سے بھی مولانا کی وسیع قلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ ہماری برادری میں اپنے مخصوص مضمون نگاروں سے ملانا تو کیسا، ان کے پتے تک دوسرے ایڈیٹروں کو نہیں بتائے جاتے۔

مولانا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے لاہور کے متعلق ہندوؤں کا خیال تھا کہ لاہور ہندوستان میں آئے گا۔ اس لیے ہندو لاہور میں جمع رہے۔ خنجر زنی کی وارداتوں کے بعد آتش زنی کے واقعات ہونے لگے۔ ان ہی میں مولانا کا گھر بھی جل گیا۔ میں جب دہلی سے اہلہ کر لاہور پہنچا تو ایک دن سربراہ ملاقات ہو گئی۔ مولانا مجھے دیکھ کر اپنی پریشانیوں بھول گئے۔ بے حد متاسف ہوئے۔ بار بار پرسش احوال فرماتے تھے اور ان کے چہرے پر ایک غم ناک مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ رہنے کو گھر مل گیا ہے، جان سچی لاکھوں پائے۔ بعد میں مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا پر تو خود پیغمبری وقت پڑا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اسی افراتفری کے زمانے میں ایک اور ادبی رسالے کے ایڈیٹر انارکلی میں ملے تو بڑے زور کا ہتھیار لگا کر انہوں نے فرمایا۔ "اچھا! آپ بھی آگئے۔ اب تو زبان کی ذمہ داری بھی ہم پر آن پڑی۔" میں نے زہر خند کے ساتھ ان کو جواب دیا کہ "آپ زبان کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ زبان تو وہاں ہے جہاں ہم ہیں۔" اس پر انہوں نے اور بھی ڈھٹائی سے ہتھیار لگایا اور چل دیے۔

مولانا کے کچھ اپنے اصول تھے۔ ادھر کی دنیا چاہے ادھر ہو جائے مگر مولانا اپنے اصول سے نہیں پھرتے تھے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی حکومت سے مالی امداد نہیں لیں گے۔

پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اسی اصول پر قائم رہے۔ مولانا چاہتے تو قیام پاکستان کے بعد انھیں نہایت اعلیٰ درجے کی ایک کونٹری لائبریری کے فیشن ایبل علاقے میں الاٹ ہو جاتی۔ کسی بہت بڑے ہندو اخبار کا دفتر انھیں مفت مل جاتا۔ کسی بڑے پبلیشر کا پورا چھاپہ خانہ کوریوں کے مول مل جاتا۔ مگر ان کی غیرت و دیانت نے اسے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے ساری عمر محنت سے اپنی روٹی کمائی۔ اس لیے انھوں نے مصنفت کی دولت کو ٹھکرا دیا۔ اسی مال روڈ پر حالات سدھر جانے کے بعد ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور اللہ کا نام لے کر پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ "ادبی دنیا" کے ساتھ ساتھ اب مولانا نے سستی کتابیں چھاپنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اپنے ادارے کا نام انھوں نے "اکادمی پنجاب" رکھا اور کئی سستی کتابیں چھاپیں۔ سستی سے مراد یہ ہے کہ لاگت پر بہت کم منافع رکھ کر کتاب کی قیمت مقرر کی۔ ورنہ دوسرے پبلیشر لاگت کے مقابلے میں کتاب کی قیمت تین اور چار گنتی تک رکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سستی اور عمدہ کتابوں کی یہ اسکیم خاصی کامیاب رہی۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا کوئی امیر آدمی نہیں رہ گئے تھے۔ اس سستے کاروبار میں انھوں نے کئی ضخیم کتابیں بھی چھاپیں۔ مثلاً دیوان شیفتہ، حیات جاوید، میراجی کے نثری مضامین کا مجموعہ اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب اردو ادب میں طنز و مزاح۔

اس سستے کاروبار نے مولانا کو سستا "ادبی دنیا" چھاپنے کی راہ سمجھائی۔ رسائل کی عام روش یہ ہے کہ تقریباً سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھتے ہیں۔ یعنی روپیہ سیکڑہ۔ پانچ سو صفحے کی قیمت پانچ روپے اور ہزار صفحے کی قیمت دس روپے۔ مگر مولانا نے "ادبی دنیا" کے دورِ جدید میں تین سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھی۔ ایک تو رسالہ ویسے ہی گھائے کا سودا ہوتا ہے، اوپر سے مولانا نے قیمت پر رکھ دی۔ پرچہ تو ایک دم سے پھلانگیں بھرنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ گھانا بھی پھلانگیں بھرنے لگا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا اس نقصان کو کہاں سے پورا کرتے تھے۔ اکلوتا مکان بیچ کر اس تجربے پر لگا دینے کی دھمکی وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ شاید یہ بھی کہ گمراہ ہوں گے۔ دراصل رسالوں کا خسارہ یا تو اشتہاروں سے پورا کیا جاتا ہے، یا کتابوں کی فروخت سے۔ مولانا نے ان دونوں مددوں کی طرف توجہ دی تھی۔ سستی کتابوں کا بوجھ

انہوں نے کیا تھا وہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اشتہارات حاصل کرنے کا بھی انہیں کافی تجربہ تھا۔ کیوں کہ "ادبی دنیا" خریدنے سے پہلے مولانا نے ایک اشتہارات مہیا کرنے والی کمپنی قائم کی تھی۔ پھر ایف، ایم سائی جیسا اشتہارات کا کام کرنے والا آدمی انہیں "ادبی دنیا" کے ساتھ مل گیا تھا۔ یہ مسٹر سائی جی دتی میں پہلی دفعہ ملے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو تنخواہ کیا ملتی ہے اور آپ اپنے رسالے کے لیے اشتہارات کتنے کے مہیا کرتے ہیں؟ مسٹر سائی جی نے بتایا تھا کہ انہیں تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے اور وہ ایک ہزار کے اشتہار لاکر دیتے ہیں۔ اور جب "ادبی دنیا" کا خاص نمبر چھپا تو اس میں تین ہزار کے اشتہارات تھے۔ یہ اُس سستے زمانے کا ذکر ہے جب سفید کاغذ کا ریم چار روپے کا تھا (اب چھتیس روپے کا ملتا ہے) گویا آج کل کے حساب سے ۲۷ ہزار کے اُس میں اشتہارات تھے۔ خیر، تو مولانا کو اشتہارات کا بھی تجربہ تھا۔ اور اب کتابوں کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ لہذا انہوں نے اس نئے اور سستے "ادبی دنیا" کے لیے واقعی اتنے اشتہارات حاصل کر لیے کہ اُردو کے کسی اور رسالے کو میسر نہ آسکے۔ مگر میرا اندازہ یہی ہے کہ اشتہارات کی اس کثرت کے باوجود مولانا کو نقصان ہی رہتا ہوگا۔ کیوں کہ پرچے کی مانگ روز افزوں تھی اور صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ پرچہ جتنا زیادہ چھپے گا، نقصان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ہاں اگر عمر وفا کرتی تو مولانا مزید اشتہارات حاصل کر کے اس نقصان کی تلافی کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاتے۔ وہ دُھن کے پکے آدمی تھے۔ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے تھے۔ گھر بار کے فکر سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ ان کے دو بچے ماشاء اللہ سی ایس پی افسر ہو گئے تھے۔ اور چھوٹے صاحب زادے میاں فصیح الدین احمد بھی ایم اے پاس کر چکے تھے۔ لہذا کام مولانا پر پلا ہوا تھا اور مولانا کام پر پلے ہوئے تھے۔

لکھنے پڑھنے کے علاوہ ان کا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا نے بہت کم لکھا۔ مولانا کلاسیکی ادب پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں سے انہیں دلہانہ شینفتگی ہو گئی تھی۔ اور شاید پروفیسر آزاد کا فیضِ روحانی ہی تھا کہ مولانا بھی اپنے قلم سے آبِ حیات ٹپکانے لگے تھے۔ اب وہ دور آ گیا تھا کہ لاہور میں کوئی سربر آوردہ ادیب باقی نہیں رہا تھا۔ مولانا

مردے از غیب بن کر سامنے آئے اور ادب کے مطلع پر چھا گئے۔ ادبی تقریبوں اور ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے مولانا سے زیادہ موندوں شخصیت اب کوئی اور نہیں ملتی تھی۔ مولانا نے سر عبدالقادر کی یاد تازہ کر دی۔ اب ادب کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کا درد بھی ان کے دل میں بیدار ہو گیا تھا اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی مولانا کی طلب ہونے لگی تھی۔ مگر مولانا بعین اُس وقت میں ہم سے جدا ہو گئے۔ جب ہمیں ان کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ آخر میں وہی کچھ دُہرانا چاہتا ہوں جو میں نے ساقی میں لکھا تھا کہ :

”مولانا صلاح الدین احمد مدبر“ ادبی دُنیا، کا ہم سے رخصت ہو جانا

اُردو کی بد نصیبی اور ادب کی غلامت ہے۔ مولانا نے جب سے ہوش سنبھالا، اُردو

کی خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے ان سے قلم چھین لیا۔

مولوی عبدالحق کے بعد اُردو صلاح الدین احمد ہی کے سایہ عاطفت میں آگئی تھی۔

مولانا ہی اُردو کے گیسو سوار تھے اور مولانا ہی اُردو کی حمایت میں سینہ سپر

ہو جایا کرتے تھے۔ اٹھوں نے اُردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور

اُردو کے لیے اپنا گھر لٹا دیا تھا۔ ہماری طرح زبانی ہمیں بلکہ واقعی۔ جب مولانا

نے ایک روپے میں تین سو صفحے کا ”ادبی دُنیا“ دینا شروع کیا تھا تو استفسار

کرنے پر مولانا نے فرمایا تھا کہ میرے پاس اب صرف ایک گھر رہ گیا ہے، میں

اسے بھی بیچ کر اس آخری تجربے پر لگا دوں گا۔

”آخری“ کا لفظ مجھے اسی وقت کھٹکا تھا۔ مولانا کو اس کا یقین ہو گیا تھا

کہ انہیں اب دو تین سال سے زیادہ جینا نہیں ہے۔ شاید اللہ کے نیک بندوں کو

موت کا سایہ نظر آنے لگتا ہے۔ مولانا واقعی دو تین سال بعد اچانک ہم سے رخصت

ہو گئے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی مگر اُردو ہی کے کام سے انہیں منہ مٹھ کر جانا پڑا اور

وہیں موت نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ مولانا کیا گئے ان کے ساتھ ایک بہت

بڑی روایت بھی ختم ہو گئی۔ مولانا صلاح الدین احمد کے بعد اُردو یتیم و سیر ہو گئی اور

ایک ایک کا مُنہ نکا کرے گی۔ ایسا جاننا اور شنقن سردھرا سے اب کہاں نصیب

ہوگا۔ وہ بات کوہن کی گئی کوہن کے ساتھ

علامہ راشد الخیری

(۱)

دہلی کے ایک ممتاز مولویوں کے خاندان سے مولانا کا تعلق تھا۔ والد حیدر آباد دکن میں ملازم تھے اور بیوی بچوں سے بے پروا۔ مولانا کو ان کی اماں نے پالا اور میٹرک تک تعلیم دلائی۔ دہلی میں سب عالم اور واعظ تھے۔ مولانا نے بھی ابتدا میں وعظ کہنا شروع کیا تھا، مگر بعد میں ایک مقامی سرکاری دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولانا بچپن ہی سے بڑے غیور تھے۔ اس لیے ابتدائی عمر عسرت میں بسر ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع کے مضامین اپنے چھوٹے مولوی نذیر احمد دہلوی کو دکھائے، اور ان سے اصلاح لی۔ جب مخزن نکلا تو اس میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے اور دنیائے ادب میں مشہور ہونے لگے۔ سر عبدالقادر دہلی آگئے تو ان سے مولانا کے روابط بڑھ گئے۔ اور جب وہ پیرسٹری کے لیے انگلستان گئے تو ادا کے فرائض مولانا کو سونپ گئے۔ اسی زمانے میں مولانا نے لکھنے کی مشق بڑھائی۔ اس زمانے میں کم پیسوں میں دائمی حقوق خرید کر دہلی کے بعض ناشرکت ہیں چھاپا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک سے مولانا کو بھی کچھ تعلق خاطر تھا۔ مولانا نے اپنی ابتدائی تصانیف ان صاحب کے ہاتھ اٹنے پونے بھیجیں۔ ہوتا یہ کہ جب کبھی مولانا کو کچھ روپے کی ضرورت ہوتی، دو چار دن میں ایک ناول لکھ کر بیچ ڈالتے۔ مولانا نے پچاس پچاس روپے میں اپنی بعض کتابوں کا حق تصنیف بیچ ڈالا تھا۔ عجب بے نیاز طبیعت پانی تھی۔ سستی فروخت کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا، جب واحدی صاحب نے مولانا سے کتابیں محفول معاوضے پر لکھوانی شروع کیں۔ مولانا اس زمانے میں ضرورت کے

تخت لکھتے تھے۔ اب ان سے، اگر ان کی کوئی ضرورت اٹکی نہ ہو تو، کیسے لکھوایا جائے، ہوا حدی صاحب نے ان سے دو تین گھنٹے روزانہ لکھتے رہنے کا معاہدہ کیا۔ مولانا گھر سے آتے تو واحدی صاحب ان کی ضرورت کی سب چیزوں کے ساتھ انہیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور مولانا دو تین گھنٹے لکھ کر پینے میں شریا اور باہر نکلتے۔ اس طرح صبح زندگی، شام زندگی وغیرہ لکھی گئیں۔ اس عرصے میں مولانا نے اپنا پرچہ "عصمت" خواتین کے لیے جاری کر دیا تھا۔ مولانا نے سرکاری دفتر کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گھر کا خرچ قلم چلا کر مہیا کرتے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کے بڑے صاحب زادے رازق الخیری صاحب نے عصمت مرتب کرنے اور عصمت بک ڈپو قائم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور رازق صاحب کی محنت ہی سے ادارہ عصمت نے وہ فروغ پایا کہ آخری عمر میں مولانا دہلی کے اچھے خاصے رئیس آدمی سمجھے جاتے تھے۔

مولانا نے نامساعد حالات میں ہوش سنبھالا تھا اور بڑی صعوبتیں برداشت کی تھیں ان کا دل بہت کمزور تھا۔ ذرا سے غم سے مہر آتا، ذرا سے دکھ پر (چاہے پرایا ہی کیوں نہ ہو) تڑپ اٹھتا تھا۔ مسلمان عورتوں کے حقوق کے لیے ساری عمر لڑتے رہے۔ اور اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ دل کی اس کمزوری نے انہیں مصوّر غم بنایا۔ اردو ادب میں ان سے زیادہ دردناک ٹریجیڈی اور کسی نے نہیں لکھی۔ لوگ طنزیہ انہیں "رونے رُلانے کے استاد" کہتے تھے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان عورتوں کو دق ہونے کے جو اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب مولانا رازق الخیری کی کتابیں بھی ہیں۔ مگر وہ شاید یہ مجھول گئے کہ مولانا نے عورتوں کو اُس لمبی بیماری سے چھڑایا جس میں مردوں نے انہیں مبتلا کر رکھا تھا۔

مولانا نے ایک کتاب بڑے احترام و اہتمام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ہے "امنہ کالال"۔ مولانا عاشق رسولؐ تھے۔ یہ کتاب بڑی محنت و عقیدت سے بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا روزانہ اُس کے لکھنے سے پہلے غسل فرماتے، اُچلے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، مصلیٰ بچھاتے، نماز پڑھتے، اگر بتیاں اور لوبان لگاتے۔ پھر لکھنے بیٹھتے۔ ان کی باقی سب کتابیں اور مفہمین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔

مولانا راند پوراؤں، بینیموں اور غریب رشتہ داروں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے اور اس خاموشی کے ساتھ کہ اس ہاتھ کی خبر اس ہاتھ کو نہ ہوتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کا کتنا بڑا حلقہ ان کے سہارے پل رہا تھا۔

مولانا کو بد زبانی یا بد کلامی کرتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے انہیں کبھی غصہ آتے بھی نہیں دیکھا۔ اپنے عزیزوں کے لیے بے قرار رہتے۔ ایک ایک کے گھر جا کر خیریت معلوم کرتے۔ بیوی بچوں پر توجہ ہی چھڑکتے تھے۔ اب سے دوڑ میاں صادق الخیری کو موتی جھرہ ہوا تو دیوانہ داران کے پلنگ کے چکر کاٹتے رہتے۔ راتوں کو پتی کے پاس بیٹھے رہتے۔ بچوں سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے۔ بلکہ اکثر ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے۔ ہم عمر بے تکلف دوستوں سے وہ چھوٹ کا مذاق ہوتا کہ الہی توبہ، بالخصوص قاضی سرفراز حسین اور خواجہ فضل احمد شیدا سے۔

علامہ راشد الخیری بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ہمیشہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ گویا مرض بہت معمولی ہے اور طبیعت ٹھیک ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے وئی کے ایک ماہر امراضِ سینہ نے معائنہ کے بعد نہایت محفوظ سے پن سے اعلان کر دیا کہ پھیپھڑے کا کینسر ہے اور مریض کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ مولانا اس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی پر بے خوف و خنت ہو گئے۔ بولے۔ ”ڈاکٹر صاحب، میں جانتا ہوں کہ میں مرنے رہا ہوں۔ اس کا اعلان کرنا ہی کیا ضرور تھا؟“ انہیں اس سے رنج پہنچا کہ بیوی بچے ہر اسان اور نا امید ہو گئے۔ انہیں اس کا شدید احساس تھا کہ تیمار دارِ سمحت پریشان ہیں۔ ڈاکٹر کے اعلان نے ان کی پریشانی میں مایوسی بھی شامل کر دی۔ آخری وقت میں بھی مولانا کا احساسِ ظرافت زندہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مولانا کے بھانجے حاجی مہر میاں بخاری آگئے۔ ہم قد سے سادہ لوح آدمی ہیں۔ چارج پنجم کا انتقال انہیں دنوں ہوا تھا۔ مولانا سے حاجی جی بولے :

”بادشاہ کے تخت پر تو اب بادشاہ کا لڑکا ہی بیٹھے گا۔“

مولانا نے سخیف آواز میں فرمایا : ”مہنیں تمہارے حق میں وصیت کر گئے ہیں۔“ اور

سب کھٹکھٹلا کر ہنس پڑے۔

(۲)

اللہ اللہ کیسی شہ گھڑی تھی وہ، حیرت میاں آتی کی اماں بی بی رشید الزماں نے اپنے اکلوتے بیٹے سے کہا تھا کہ "بیٹا، تم کہانیاں لکھا کرو" اور کم عمر میاں آبی نے حیرانی سے اماں کا مُنہ تکنتے ہوئے کہا تھا۔ "مگر اماں بی مجھے تو کہانی لکھنی نہیں آتی" اماں نے نہایت شفقت سے فرمایا "بیٹا میں سُناؤں گی تمہیں کہانیاں۔ تم بس یہ کہنا کہ انہیں لکھ کر چھپو ادیا کرنا" یہ کہہ کر کہنے ہی کا ایک واقعہ سُنا یا کہ سوتیلی ماں نے کم سن بچوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھار رکھے تھے۔ میاں آبی نے اس کہانی کو ذرا بنا سنوار کر لکھا اور یہ کہانی "محزون" میں چھپ گئی۔ اس پہلی کامیابی پر ماں بیٹے دونوں بہت خوش ہوئے۔ بس اس کے بعد میاں آبی کا ہیبا ڈکھل گیا اور انہوں نے باقاعدہ مضامین اور کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ یہ واقعہ اب سے ساٹھ ستر سال پہلے کا ہے۔ یہ میاں آبی دلی کے ایک معزز مولویوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چھٹپن ہی میں ان کے والد عبد الواحد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی والدہ بڑی صابر اور غیور خاتون تھیں۔ خاندان کے بزرگوں نے بہت چاہا کہ ان کا نکاح ثانی کر دیں، مگر انہوں نے منظور نہیں کیا۔ اور پہاڑسی جوانی سُسرال میں اپنے دو بچوں کے ساتھ کاٹ دی۔ جب میاں آبی سیانے ہوئے اور کمانے دھمانے لگے تو ان غیرت مند بی بی نے سُسرال سے بہت دور شہر کے دوسرے حصے میں اپنا ایک کھنڈ لا بنا لیا۔ اور تنگی ترستی سے بسر اوقات کرتی رہیں۔ اسی تنگ دستی میں انہوں نے سلیقہ مندی سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کی اور یہ بھی بیاہ کر لائیں۔ اور یہ دونوں شادیاں اس پیمانے پر کیں کہ سُسرال والوں کو ان پر اُننگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

آپ سمجھے بھی یہ "میاں آبی" کون تھے؟ یہ تھے عبدالرشید، جو "محزون" میں مولوی عبدالرشید کے نام سے آئے۔ اس کے بعد عبدالرشید الجیری اور پھر صرف راشد الجیری کے نام سے مضامین اور کتابیں لکھتے رہے۔ اور اب دُنیا انہیں علامہ راشد الجیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ علامہ مرحوم کا تعلق چوں کہ حبیبہ مولویوں کے خاندان سے تھا۔ اس لیے مذہبی ماحول میں انہوں نے ہوش سنبھالا۔ تجویز یہ تھی کہ یہ بھی اپنے پُرکھوں کی طرح وعظ کہنے اور تبلیغ کرنے کے لیے وقف ہو جائیں۔ لہذا اسی نقطہ نظر سے ان کی تربیت ان کے دادا دادی اور والدہ نے

کی۔ علامہ مرحوم نے آغازِ جوانی میں وعظ کہنا شروع بھی کر دیا تھا۔ آواز اپنی اور گرج دار تھی۔ اس لیے سامعین کو متاثر کر لیتے تھے۔ مگر وہ پیشہ ور واعظ نہیں بننا چاہتے تھے۔ باپ کا سایہ کم عمری ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ دادا بہت امیر آدمی تھے مگر ان کی امارت سے انہیں کوئی فائدہ پہنچنے کی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ دادا کی موجودگی میں بیٹے کے مرنے سے شرعاً وہ محروم الارث ہو گئے تھے۔ لہذا مولانا چاہتے تھے کہ جلد از جلد خود کمانے کے لائق ہو جائیں۔ طبیعت کا رجحان لکھنے لکھانے کی طرف تھا۔ لہذا میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مضامین لکھتے رہے اور نوکریاں کرتے رہے۔ نوکری سے بھی رغبت نہیں تھی، اس لیے افسروں سے نہیں بنتی تھی اور نوکریوں کو بونٹیوں کی طرح بدلتے رہتے تھے۔ اور نوکریاں تھیں کہ ان کی بونٹیوں سے لگی پھرتی تھیں۔ ادھر ٹیپو ادھر ملی۔ جب لاہور سے منتقل ہو کر "مترن" دلی آیا تو شیخ عبدالقادر صاحب نے مولانا کو اپنا دستِ راست بنا لیا۔ شیخ صاحب ہی کے اصرار پر انہوں نے ناول نگاری شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھ کر اپنے مچھپا اور استاد ڈپٹی نذیر احمد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا۔ خبر نہیں اس ناول میں کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ناراض ہوئے۔ اور تاکید کی کہ اگر ناول لکھنا چاہتے ہو تو ایسے لکھو جیسے میں لکھتا ہوں۔ مولانا نے اپنے اس ناول کا مسودہ ضائع کر دیا اور ڈپٹی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ناول "صالحات" لکھا۔ اسے دیکھ کر ڈپٹی صاحب خوش ہو گئے۔ اور انہوں نے فرمایا کہ "اگر مجھے یقین کا مل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ "صالحات" میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری گیا۔"

پسندیدگی کی سند استاد سے پانے کے بعد مولانا نے ملازمت کو دھنا بتائی اور قلم ہی کے ہو رہے۔ دوست احباب سب اچھے ملے۔ سب سے زیادہ جو صلہ افزائی کرنے والے تو شیخ عبدالقادر صاحب ہی تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمد اکرام، مولوی اشرف حسین، شہزادہ مرتزا ارشد گورگانی، فاری سرفراز حسین، ان کے علاوہ واحدی صاحب، خواجہ حسن نظامی، عارف ہسوی، آصف علی پیرسٹر، خواجہ فضل احمد شیدا۔ سبھی اعلیٰ ادبی ذوق کے لوگ تھے۔ واحدی صاحب، جن کا ابھی میں نے نام لیا ہے اور جو حسن اتفاق سے کراچی ہی میں موجود ہیں، عجیب مقناطیسی نصیبت کے بزرگ ہیں۔ کوچہ چیلان میں ان کا دولت کدہ ادیبوں کا مرجع تھا۔ واحدی

صاحب ادیب بھی ہیں اور ادیب گم بھی۔ انھوں نے ساری عمر اچھے سے اچھے رسالے نکالے اور ادب کی خدمت کے لیے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ مولانا راشد الخیری کے مزاج میں درویشی کا لایا بی بی تھا۔ انھیں اس کا احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم المرتبت مصنف بن گئے ہیں۔ لوگ ان کے مضامین اور کتابیں پڑھنے کے لیے چشم براہ رہتے تھے۔ مگر وہ سب سے بے پروا صرف اس وقت لکھتے تھے جب ان کا جی چاہتا تھا۔ واحدی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے مولانا سے زبردستی لکھوایا۔ وہ اس طرح کہ مولانا کو روزانہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیتے اور چند گھنٹے بعد مولانا کو کُنڈھی کھول کر باہر نکالتے تو مولانا پیسے میں شرابور برآمد ہوتے اور میز پر ۲۵-۳۰ صفحات لکھے ہوئے موجود ہوتے۔ غالباً "شامِ زندگی" اسی طرح لکھوائی گئی۔

مولانا نے ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ "عصمت" جاری کیا، اور اس کے دو سال بعد ایک مردانہ پرچہ "تمدن" نکالا۔ اس زمانے میں مولانا نے کتابیں کم لکھیں۔ مگر چند سال بعد ان کے خلیفہ اکبر مولانا رازق الخیری نے "عصمت" کو سنبھال لیا۔ اور تمدن کو ان کے دوست قاری سرفراز حسین کے صاحب زادے عباس حسین صاحب نے مانگ لیا تو مولانا مغفور کو کتابیں لکھنے کی فرصت مل گئی۔ اور انھوں نے تاثر توڑ کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی راشدہ بیگم صاحبہ بیابہ کر گنگا پور چلی گئی تھیں۔ مولانا گنگا پور جاتے تو فرصت ہی فرصت ہوتی۔ یہیں انھوں نے منجملہ اور کتابوں کے "آسنہ کالال" اور "فاطمہ کالال" جیسی بے مثل کتابیں لکھیں۔ آپا راشدہ کا بیان ہے کہ ابا جان صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک کمرے میں اگر بتیاں جلاتے۔ ایک طشتری میں مچھول بھر کر اپنے پاس رکھ لیتے، اور فرش پر موڈ بانہ بیٹھ کر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ جبھی تو یہ دونوں کتابیں سدا یہاں رہیں، اور رہتی دنیا تک مہکتی رہیں گی۔

مولانا کے پہلو میں ایک چوٹ کھایا ہوا دل تھا۔ چھوٹی سی عمر میں یاپ کے سائے سے محروم ہوئے۔ ماں کی عمر رنڈا پے میں کٹی۔ ددھیال کی محتاجی اور تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ امیر دادا کے ورثے میں سے غریب پوتے کو کچھ نہ ملا۔ خلاف مزاج نوکریاں کرنی پڑیں۔ ددھیال

بھی امیر اور شخصیات بھی امیر، مگر خود پردیس میں چھوٹی تنخواہ کے نوکر۔ بیوہ ماں اور چھوٹی بہن کا ساتھ۔ پریشانیوں کے ہجوم میں زندگی کے ابتدائی سال گزرے عم ان کے گھٹ میں اتر گیا تھا یہی عم ان کی تحریروں میں بھی رچ گیا تھا اور حزن نگاری ان کے لیے مخصوص ہو گئی مگر کس بلا کا عم اور کس غضب کا حزن تھا کہ ہم نے لوگوں کو ان کی کتابیں پڑھ کر دھاروں دوتے دیکھا۔ ان کے اسی اندازِ تحریر کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی نے مولانا کے نام سے پہلے ”عم ادا“ لکھنا شروع کر دیا تھا، اور بھٹی احسان نے انہیں ”مصوّر عم“ کا خطاب دیا تھا۔ اور یہ خطاب اس درجہ موزوں ثابت ہوا کہ مولانا کے نام کا بجز ولاینفک بن گیا۔

شیخ عبدالقادر اور واحدی صاحب کے بعد تیسرا نمبر رازق الجیری صاحب کا ہے۔ بلکہ سب سے اہم رول (ROLE) موثر الذکر ہی کا ہے کہ انہوں نے کتابت، طباعت و اشاعت وغیرہ کے چمکندوں سے علامہ مرحوم کو فارغ کر دیا۔ اور محنت و دیانت داری سے عصمت کو اتنا فروغ دیا کہ اس کی اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے دس گنی ہو گئی۔ علامہ اطمینان قلب سے کتابیں لکھتے رہے۔ اور مولانا خاص اہتمام سے انہیں چھاپتے رہے۔ اس دھندے میں اتنی برکت ہوئی کہ روپے کی ریل پیل اور گھر میں لہر مہر ہو گئی، اور جب علامہ ۱۹۳۶ء میں ہم سے رخصت ہوئے تو اچھے خاصے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا رازق الجیری نے ”عصمت“ کے علاوہ دو اور رسالوں ”بنات“ اور — ”جوہر نسواں“ کو بھی بااثر ترقی پر پہنچا دیا اور سیکڑا۔ کہ نہیں بھی چھاپ ڈالیں۔ مگر ایک ضروری کام رہا جاتا تھا۔ اس کا خیال انہیں علامہ مرحوم کی وفات ہی کے بعد سے ستارہا تھا۔ مولانا اپنے والد مرحوم کی سوانح عمری ایک نئے انداز سے لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے اسی وقت سے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر ۱۹۴۰ء کے آشوب میں ان کے پیش یہاں مسودات ضائع ہو گئے۔ اور کراچی جانے کے بعد حالات نے انہیں سنبھلنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اب چند سال سے مولانا کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اور انہیں محسوس ہوا کہ اس فرض کو مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا دن رات ایک کر کے انہوں نے علامہ مرحوم کی سوانح عمری سال ڈیڑھ سال میں تیار کر لی۔ اس کی اشاعت کے لیے انہیں جو

ہفت خواں طے کرنے پڑے ، ان کی ایک الگ داستان ہے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع
ہمیں ہے ۔ بہر حال اللہ نے یہ مشکل بھی آسان کی اور مولانا اپنے فرض سے ادا ہوئے ۔

یہ سوانح عمری "عصمت" کی ۵۶ ویں سال گرہ پر "عصمت" کے ایک خاص نمبر کی صورت
میں شائع ہو گئی ہے ۔ مولانا کا کارنامہ آپ کے سامنے ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے اور اس محنت
کی داد دیجیے ۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکون

تا بساند نام نیکت برترار

قاری سرفراز حسین دہلوی

یادش بخیر دہلی مرحوم کی آخری بہار میں شاہ جہانی دیگ کی کھرچن باقی رہ گئی تھی اُسے میری آنکھوں نے بھی دیکھا اور اب بھی جب کبھی اس کا خیال آجاتا ہے تو زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ ہا! کیسی کیسی صورتیں پیوند خاک ہو گئیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ یوں تو ۱۷۵۷ء کی آندھی میں لال پورے کے پرزے اڑ گئے تھے اور مغلوں کا آفتاب جاہ و جلال غروب ہو گیا تھا مگر سخت جان دتی نے ایسے سیکڑوں انقلاب دیکھے تھے، بگڑ کر پھر سنور گئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کی آبرو رکھ لی اور ایک نئی تہذیب کا ڈول ڈالا۔ علی گڑھ نے مغرب اور مشرق میں سوئے ہوئے نوجوان مسلمانوں کی کھوپڑی پر کھوپڑی نکالنی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کیا۔ انہیں جوانوں میں سے ایک رُوداد جوان قاری سرفراز حسین دہلوی تھے جنہوں نے اس صدی کے ابتدائی تیس سونتیس سال میں دھوم مچا رکھی تھی۔ زمانہ بڑا ناقدر اور زود فراموش ہے۔ افسوس رُبع صدی ہی میں قاری صاحب کو لوگ بھولنے لگے۔ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے۔

میرے والد کے پاس جو حضرات اکثر آتے تھے اور جن کے گھر وہ اکثر جایا کرتے تھے ان میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بڑے کھلے کھلے تھے۔ دہراڈیل، کسرتی بدن، سرپر کھسٹی کی ترک کی ٹوپی، کالا فراک کوٹ، سفید تپلون، پاؤں میں ڈاسن کا کالا شٹو، دائیں ہاتھ میں چھتری، بائیں ہاتھ میں سفید دستانے، گول چہرہ، گہواں رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، موزوں دہانہ، کتر واں منچھیں، مختصر سی خوش نما ڈاڑھی، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، جن میں سے ان کی ذہین آنکھیں اپنی چمک دکھاتی رہتیں۔ ان سے ہمارے گھر میں پردہ مہیں کیا جاتا تھا۔ آبا انہیں دیکھتے ہی کھل جاتے اور اپنی ساری سنجیدگی و بردباری بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ قاری سرفراز حسین غزنی

دہلوی، جو اپنی باتوں سے طرافت کے پھول کھلاتے رہتے۔ بڑے زندہ دل، بڑے خوش کلام۔ ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ زندگی پر آٹھ دس ناول لکھے جن میں سب سے مشہور "شاہد رعنا" ہے۔

یہ وہ کتاب ہے جسے دیکھ کر مرزا اسوانے "امراؤ جان ادا" لکھی۔ ناولوں کے علاوہ فارسی صاحب نے علم الکلام پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ تبلیغ کے سلسلے میں انگلستان اور جاپان تک گئے تھے۔ فارسی صاحب اس قدر خوش گفتار تھے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے لیے ترستے تھے۔ مذہب، ادب، سیاست، تاریخ، کسی گھر بند نہیں تھے۔ ایک دفعہ مسوری میں ایک رئیس نے چاہا کہ فارسی صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی باتوں سے ان کا جی بہلایا کریں۔ فارسی صاحب نے ٹالنے کے لیے کہلوا دیا کہ میں ستواروپے فی گھنٹہ لوں گا۔ اگر منظور ہو تو طلب فرمائیں۔ وہ بھی بگڑے دل رئیس تھے۔ دو سو روپے روزانہ دیتے رہے۔ اور فارسی صاحب وہ روپیہ انجمن اسلامیہ کو بھیجتے رہے۔

فارسی صاحب گو میرے خاندان سے نہ تھے لیکن میرے خاندان سے ان کے تعلقات بالکل عزیزوں ہی کے سے تھے۔ میرے والد کے خلیفے بھائی مولوی اشرف حسین صاحب جنھوں نے مشنری میر حسن پر مقدمہ لکھ کر میر حسن کو حیات تازہ دی تھی۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر اجمل حسین سول سرجن لاہور کے والد اور سید انصار ناصری ڈاکٹر ریڈیو پاکستان کے نانا تھے، ان سے فارسی صاحب کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ مولوی اشرف حسین صاحب کی وجہ سے فارسی صاحب ہمارے قدیمی محلہ کو چھ تو اب مرزا میں تقریباً روز آتے تھے۔ ویسے تو میرے والد مولوی بشیر الدین احمد سے فارسی صاحب کے تعلقات بہت تھے لیکن والد مرحوم کی انتہائی سنجیدہ مزاجی اور بزرگی کے باعث فارسی صاحب ان سے بہت ادب قاعدے سے ملتے تھے۔ ان کے علاوہ شاید ہمارے خاندان کا کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جو فارسی صاحب کی بذلہ سنجی اور پھینسیوں کا ہدف نہ بنا ہو۔ گھر میں اکثر فارسی صاحب کا ذکر ہوتا تھا۔ جس میں فارسی صاحب کی طرافتوں کو سراہا جاتا تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے میرے کانوں میں برابر فارسی صاحب کا نام پڑتا رہا۔ اور اس چوکڑی کا تذکرہ بھی بہت ہوتا تھا جس میں مولوی اشرف حسین صاحب، مرزا محمد اشرف گورکافی صاحب، فارسی سرفراز حسین صاحب اور علامہ راشد الخیری شامل تھے۔ جب یہ چوکڑی جمتی تو فارسی صاحب کو کوئی نہ کوئی نئی سوجھتی۔ ایک دفعہ چھوٹی اماں بڑے

مرے لے لے کر بیان کر رہی تھیں کہ قاری صاحب نے دھوبن کی آنکھ بچا کر اس کی گھٹری میں ایک بھاری پتھر باندھ دیا۔ اب میسے کپڑوں کی گھٹری بے چاری سے کسی طرح اٹھتی ہی نہ تھی۔ جب وہ گھٹری اٹھانے کی کوشش کرتے کرتے ہلکان ہو گئی تو مرزا محمد اشرف صاحب اور مولوی اشرف حسین صاحب کو دھوبن پر زبرس آگیا۔ انہوں نے بھانڈا اچھوڑ دیا۔ اور اس طرح گھٹری میں سے پتھر نکال کر پھینکا گیا۔ چونکہ دھوبن بہت پریشان ہو گئی تھی اور گھٹری اٹھانے اٹھانے تمسک گئی تھی، اس لیے ایک دم سے بالکل بکھر گئی۔ اور اُس نے بڑا فیصل مچایا۔ ڈپٹی صاحب (میرے دادا) مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کو اطلاع ہوئی اور چوکڑی کو طلب کیا گیا لیکن یہ سب نفرو ہو چکے تھے۔ اُس وقت نوڈانٹ سے پج گئے لیکن بعد میں سب پر ڈانٹ پڑی۔ ڈپٹی صاحب کی ایک اور ڈپٹ کا ذکر بھی اکثر سنا گیا ہے۔ اس کے ہدف چوکڑی کے ڈو اراکان تھے: قاری سرفراز حسین صاحب اور علامہ راشد الخیرمی۔ ہوا یہ کہ ۱۹۱۱ء میں شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں علامہ راشد الخیرمی نے رسالہ "تمدن" جاری کیا۔ اس کے پہلے پرچے میں قاری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان تھا "انسان فرشتے کی عینک سے" یہ مضمون ڈپٹی صاحب کے نزدیک بہت قابل اعتراض تھا، اس لیے کہ اس میں مذہبی روایات کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس مضمون کا ابتدائی حصہ یہاں نقل کرتا ہوں کہ آپ بھی اس نایاب مضمون سے لطف اندوز ہوں۔

"ایک تو عمر فرشتہ جو ہنوز علماء اعلیٰ کی انتہائی تعلیم سے فارغ نہ ہوا تھا اور جسے نبایران نہ ابھی کوئی ڈگری ملی تھی اور نہ کوئی خدمت تقدیس تجید وغیرہ کی عطا کی گئی تھی، سنٹرل عرشہ کالج کی موسم بہشت گال کی تعطیل میں اپنے چیف پراکٹر مہتر فضل طاعیل کی اجازت سے چند ہفتے دنیا کی سیر کرنے کی غرض سے رفعت کورٹ سے، جو ذوالجلال بورڈنگ ہاؤس کا ایک نہایت پرفضا حصہ ہے، روانہ ہوا۔ یہ متین متعلم فرشتہ دوستوں کا بہت وسیع دائرہ نہ رکھتا تھا، پھر بھی اس کے ہم مذاق چند دوست فرشتے ایسے تھے جنہوں نے روانگی سے پہلے اسے ایک مختصر الوداعی ڈنر دیا۔ فرشتوں کو زیادہ بولنے چلنے کا شوق نہیں ہے۔ تاہم ایک آدھ ڈنر اسپچ ہونی ضروری تھی۔ فورٹھ ایرکلاس کا ایک طالب علم فرشتہ طرفیل نامی چیرز کی گونج میں اپنی نورانی کرسی پر سے اٹھا اور شام کے مہمان کا جامِ صحت تجویز کرتے وقت اس طرح گہرا فٹنٹا ہوا:

فضائے عرش کے نو عمر مکینوں کی زندگی میں آج کا دن تاریخ جاوید کا ایک نیا ورق اُلٹے گا۔ کیوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم میں سے کسی نے حضرت انسان کے مطالعے کے قصد سے دُنیا کے دُور دراز سفر کی اولوالعزمی اختیار کی ہو۔ ہمارے مقدس بزرگ مہتر جبرائیل کو عالم خلق میں تشریف لے گئے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور اب ان سے دُنیا کی کوئی تازہ خبر نہیں ملتی۔ ہمارے دوسرے مقدس بزرگ حضرت عزرائیل ہر روز، ہر گھنٹی، ہر لمحہ وہاں آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان کا کارِ منصبی گو بہت اہم ہے، تاہم محدود ہے۔ اور چونکہ ان کے محکمہ کی کُل کارروائی کا نفی دُنیشل ہے، اس لیے ہم لوگوں کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ہم نو عمر فرشتوں میں سے کوئی اولوالعزم کمرِ بہت باندھے اور دُنیا میں جا کر وہاں کے حالات قلم بند کرے۔ میں اپنے معزز دوست سرفیل کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور ان کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں۔“

بڑے بوش اور سرگرمی سے یہ جامِ طہور نوش کیا گیا۔ اب سب کی آنکھیں ظریف فرشتے کی طرف اٹھیں جنہوں نے انسان کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے حسبِ ذیل تقریر کی :

”مجھے انسان کا جامِ صحت پیش کرنے کا خاطر خواہ حق حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک مجھ کو صحیفہٴ اعظم کے مطالعہ سے معلوم ہوا۔ انسان کا تعلق فرشتوں سے کم ہے مگر حوروں سے زیادہ ہے، اور یہ ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان کو ہم سے تعلق پیدا کرنے میں سراسر تکلیف ہے۔ بے چارے کو فاقے دیے جاتے ہیں، یہ لالچ دے کر کہ تجھ میں ملکوتی صفات پیدا ہو جائیں گے۔ سونا کم کر کیوں کہ فرشتے سوتے نہیں۔ ہنسا بولنا چھوڑے اس لیے کہ فرشتے متین ہوتے ہیں۔ دن رات تسبیح لیے بیٹھا رہ، اس لیے کہ فرشتے بھی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اب آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ انسان کو کیا پڑی ہے کہ اپنی جا پر یہ سب مصیبتیں لے؟ صرف اس لیے کہ ہم سے تھوڑی بہت مشابہت پیدا کرے۔ ہم میں سے بعض تو اس کے جانی دشمن ہیں۔ اس کے کندھوں پر بیٹھ کر اس کا کچا چمٹھا لکھتے رہتے ہیں۔ بڑے آیا جان حضرت عزرائیل سے تو ہر انسان کی رُوح کا پنتی ہے (سُنو سُنو) مچلا پھرا انسان ہمیں اچھا سمجھ سکتا ہے؟ اور جب یہ حالت ہے تو اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ (افسوس افسوس) البتہ پرے تار کے لطیف طبقہ سے جنہیں ٹوریں (چیریز) کہتے ہیں، انسان کے دل کو بہت لگاؤ ہے۔ اصل

وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر پیارا شریفیل دُنیا کے سفر میں صرف ایک اس راز کا پتا لگا لیا، تو ہم سمجھیں گے اُسے کافی کامیابی ہو گئی۔ مگر ہاں قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ضعیف انسان میں لالچ کا مادہ بہت ہے اور حوریں شاید کچھ بڑی نعمت کی چیز ہوں گی۔ مناز پڑھو تو جنت میں حوریں ملیں گی۔ نیچی نگاہ کر کے چلا کرو، حوریں ملیں گی۔ یہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی، وہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی۔ وغیرہ وغیرہ (قبقہ) اب ہمیں معلوم کہ حوروں کے کس قدر پہلو ہیں کہ ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ان کا ایک نہ ایک پہلو بطور انعام کے انسان سے چفتش ہو سکتا ہے (قبقہ) انسوس کہ میرا بیان غیر مکمل بلکہ گونہ مہمل ہے، اس لیے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انسان بھی دو طبقوں میں منقسم ہے ایک غالباً کثیف اور دوسرا حوروں کی طرح لطیف۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہماری حوریں انسان کثیف کو ملیں گی تو حوروں نے کیا قصور کیا ہے؟ اور اگر انسان لطیف کو ملیں گی تو بات ہی کیا ہوئی؟ (سُنو سُنو)

پیارے شریفیل، ضرور اس کا پتا لگا بیو (چیز) ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر پھر بھی جو میں انسان کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سُننتے آئے ہیں۔ جب حضرت انسان پیدا کیا گیا تو ہمارے سب بزرگوں سے اسے سجدہ کرایا گیا۔ اور سوائے اس بزرگ کے (تو بہ تو بہ اب ہم میں سے کوئی بھی انہیں بزرگ کہنے کا مجاز نہیں ہے) سب نے سجدہ کیا۔ سجدہ نہ کرنے پر وہ بارہ پتھر یا ہر کیے گئے۔ ان کا (ایفی جی) بُت جلا یا گیا۔ اور دُفترِ قیام میں درج ہے کہ تعزیراتِ قدس کی شدید ترین دفعہ کی انتہائی سزا نہیں دی گئی (نصرہ ہائے لاسول لاسول) پھر کوئی بات تو ہے جو انسان کو یہ شرف بخشا گیا (ضرور ہوگی، ضرور ہوگی) عقل مند شریفیل کیا تم اپنے سفر میں اس معنی کو بھی حل کر لو گے؟

تقریباً جس میں ہر چند ظرافت شامل تھی جیسے پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجوزہ جامِ نوشِ جان کرتے وقت بعض معمر اور فرض شناس فرشتوں نے نوکر و نیک تک جھکالیں۔ یہ جلسہ بڑی خیر و خوبی کے ساتھ برخواست ہوا اور اس کی رُوداد موتیوں کے حروف میں چھاپی گئی۔

راوی لکھتا ہے کہ باوجودے کہ ہر طرح اہتمام کر لیا گیا تھا کہ یہ باتیں سوائے فرشتوں کے اور کسی کو معلوم نہ ہوں مگر کسی طرح اس رُوداد کی دو چار کاپیاں الجھال اکیڈمی کے پردہ راز کے

اند پر پہنچ گئیں جس سے حوروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اتفاقِ وقت جب یہ پرچے حوروں میں پہنچے تو میوزک (موسیقی) کا گھنٹہ ختم ہو کر کالج بند ہو گیا تھا اور حوریں بناؤ سنگھار کرنے اپنے اپنے کمروں میں جا رہی تھیں۔ وہاں سے بعض ٹینس کھیلنے آئیں۔ بعض سیدھی رنگ میں اسکیٹنگ کرنے جاتیں۔ یہ پڑھ کر کہ انسان حوروں کا بہت مُشاق ہے، بعض خوش بعض چین یہ جیسے ہوئیں۔ بعضوں نے آج بناؤ سنگھار اور اچھی طرح کیا۔ نئی ٹائیاں، نئے ربن (فیتے) نئے پھول لگائے اور لیونڈروں کی شیشیاں لٹھا دیں۔ (معنی نہ رہے کہ کچھ عرصے سے حوروں میں بناؤ سنگھار کا کوڈ ترمیم ہو گیا ہے)۔

پُرانی حوروں کو تو اب تک کنگھی، چوٹی، سُرمہ مستی وغیرہ کی اجازت ہے۔ لباس میں بھی قد امرت پسندی کا عیب ہے۔ بے جوڑ گنواہی گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، خلخل کرتے ہوئے پیجامے (گھینٹے ہوئے کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ مگر ماشاء اللہ نئی حوریں فیشن کی موجد ہیں) جن حوروں کو انسان سے وابستہ ہونے کا خیال ناگوار گذرا انہوں نے بالکل بناؤ سنگھار نہ کیا اور نہ کھیلنے گئیں، رو رو کر آنکھیں سُجالیں اور کئی ایک سے تو نماز مغرب بھی وقت پر ادا نہ ہوئی۔ رائٹر کا خاص نامہ نگار لکھتا ہے کہ انہوں نے کوئی کافی ڈینشل میموریل تیار کیا تھا۔ اس پر کمیٹن بیٹھا تھا جس کی رپورٹ بھی تیار ہوئی تھی مگر سوائے ان چند احکامات کے اور کوئی بات پبلک نہ کی گئی۔ وَاللّٰہُ اعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔“

ڈپٹی صاحب اس مضمون کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ دونوں کی طلبی ہوئی بِلَامَہِ اَشَدِّ الْحِزْبِی فوراً حاضر ہو گئے۔ ڈپٹی صاحب نے اُن کو بہت بُرا بھلا کہا۔ دوسرے دن قاری صاحب کی پیشگی ہوئی۔ ڈپٹی صاحب اُن پر بھی بہت برے سے۔ دونوں نے توبہ تِلَا کی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ قاری صاحب کی ان پر مذاق حرکتوں کے تذکرہ کے ساتھ اُن کی علمی قابلیت اور جاپان میں تبلیغِ اسلام کی سعی کا بھی بہت چرچا رہتا تھا۔ اب مجھے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا اور قاری صاحب کی ان متضاد قابلیتوں پر کچھ حیرانی بھی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرے یہ بزرگ کس فحاش کے آدمی ہیں؟ لیکن ان کے سامنے جانے کے بعد ان سے کچھ محبت سی ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ہم بچوں سے بڑے پیار اور محبت سے ملتے۔ اچھی اچھی باتیں کرتے، اور ہنسنے ہنسانے والے لطیفے سناتے

تھے۔ غرض یہ کہ سبب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے دل میں اُن کی خاصی قدر تھی، جو برابر بڑھتی ہی گئی۔ جوں جوں میں جوان ہوتا گیا اور لکھنے پڑھنے کی کچھ سُدھ بُدھ ہوتی گئی تو دل پر ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھتا گیا۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا کہ میں نے ۱۹۲۹ء میں رسالہ "ساقی" جاری کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے سلسلہ میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو قاری صاحب بہت محبت سے ملے۔ جو کچھ اُن سے پوچھا اُس سے زیادہ بتاتے رہے اور مضمون لکھنے کی خواہش پر اُنہوں نے کہا کہ "ساقی" میں اپنا ایک ناول مسلسل لکھا کروں گا۔ چنانچہ قاری صاحب کا ناول "نزدتِ دلہن" ساقی میں چھپتا رہا۔ اُس زمانے میں قاری صاحب کی خدمت میں مجھے اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا! انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔ اُس زمانے میں قاری صاحب کی یہ خصوصیت بھی پورے طور پر متکشف ہوئی کہ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے بن جاتے تھے۔ میں جوان ہوتا گیا اور قاری صاحب بوڑھے ہوتے گئے۔ لیکن قاری صاحب کی خوبیاں میرے دل پر اور زیادہ نقش ہوتی گئیں۔

قاری صاحب کی گونا گوں خصوصیات کا ذکر بھی وہی شخص بہتر طریقے سے کر سکتا ہے جو انہی خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مجھے اس کا دعویٰ نہیں۔ اس لیے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ قاری صاحب کی تصانیف کے اقتباسات پیش کر کے اُن کی خصوصیات کو اجاگر کروں۔ آپ نے "انسان فرشتے کی عینک سے" کا اقتباس تو ملاحظہ فرمایا۔ اب ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان بالکل جداگانہ ہے

سوال : اے دل بے مدعا، یہ بھان منی کا تماشہ ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ بیگم صاحبہ! ہر ہائی لسن سلطان جہاں بیگم (وٹی بھوپال) کی سواری دُور سے جاتی ہو، تو جہاں ہے ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے دُکھ درد کچھ کم ہیں جو تو اب صاحب کی تند رستی کم دعائیں مانگتا ہے؟ اپنے بال بچوں سے دُور پڑتا ہے۔ مگر صاحب زادے صاحب کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میری جان تجھ میں کیا کمی ہے جو ناظم صاحب، نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے؟ سچ بتا کوئی غرض تو اس میں پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ نہیں تو صرف امارت کا رعب ہے؟ یہ جو "آئیے حضرت" کہہ کر مزاج پوچھتے ہیں اُس سے دل بڑھ جاتا ہے؟

دیکھ سلامت رومی کے مرکز سے مت ہٹ۔ خوشی جس کا توبہ فضلہ تعالیٰ مالک ہے، ریاست، وزارت، نیابت، سب سے بڑھ کر ہے۔ فارغ البالی جو تجھے نصیب ہے خلش والی بے انتہا دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چل اس وجاہت پرستی سے مُنہ موڑ، گوشہ نشینی اختیار کر، اللہ کا نام لے اور فداغت اور سر درد دائمی کی موت مرنے کے لیے مردانہ وار تیار رہ۔"

جواب: "اے پیاری رُوح، اے صدائے ربانی، تیری تنبیہ، تیری چھڑکیوں اور لعن طعن پر ظاہر بینوں کی ہزار ہا تحسین و آفرین قربان۔ خدا تجھے قائم رکھے۔ تو نے اچھے وقت نہری۔ دل میں ہو کچھ چوہ ہیں ان سے تو بھی واقف ہے۔ خدا شاہد ہے بیگم صاحبہ سے بہت زیادہ عظمت دل میں اُس دکھیاری بیوہ عورت کی ہے جو چکی پیس کر اپنا پیٹ بھرتی ہے اور اپنے یتیم بچوں کا بھی۔ جسے تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی۔ عزت نہ آبرو۔ مگر جو محنت، صبر اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کر کے حیاتِ عظیم کی لانتہا بنجیر میں ایک گم نام گربے حد ضروری کر ڈی ہوتے کا ثبوت دے رہی ہے۔"

نواب صاحب کو خدا صحت اور عمر عطا فرمائے۔ سچ کہتا ہوں کہ ان کی جان سے ہزار درجہ زیادہ اس شخص کی جان عزیز ہے جو غریب کنبہ، غریب بچوں، غریب عورتوں کا وارث ہے۔ جس کو نہ کوئی تفریح و سرکار ہے نہ سامانِ عیش۔ فرض اور ادائے فرض جس کی جانِ عزیز کی صدائے پردرد ہے۔ جس پر ہر امیر جس وقت چاہے ظلم کر سکتا ہے، اور کر لیتا ہے۔ جس پر ہر آفت جس وقت چاہے، آ جاتی ہے۔ مگر جس کے دل سے گھربار کی فکر، محنت اور استقلال کا خیال ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتا۔ صاحب زادے صاحب سے کہیں زیادہ معصوم بچے دل میں ایسے ہوئے ہیں جن کو آنکھ کھول کر نہ باپ کا سایہ نصیب ہو، نہ ماں کا پکھوا۔ جو کسی کے سامنے مُنہ سے نہیں نکال سکتے کہ ہمارا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے اور کیا پہننے کو۔ عرش کے کنگورے ان کے درد پر ہل جائیں مگر بے درد دنیا شس سے مس نہیں ہوتی۔ وزراء، امرا بہت دیکھے ہیں مگر ہم تو ان سادہ مزاج سادہ حال غریبوں کے دیوانے ہیں جن کے دل خوفِ خدا سے لرزتے ہیں اور جن کو نصنع اور تکلف کی ایک بات بھی نہیں آتی۔

لیکن میری جان حقیقت یہ ہے کہ اگر توفیقِ الہی شامل حال ہو اور غریبوں کا دکھ درد کوئی اُن کو بتاتا رہے تو پھر دیکھو یہی امیرِ ظلِّ سبحانی ہیں۔ یہی امیرِ ابرِ رحمت ہیں۔ یہی بے کسوں کا سہارا اور داند بیواؤں اور یتیموں کے پشت پناہ ہیں۔ اُن کا مٹن پورا اور ان کی نجات محفوظ

ہے۔ اگر ان غریبوں کے حال پر نظرِ ترحم رہے۔ یہی دُعا ہے اور اسی لیے ان کو سلام کہتا ہوں۔“

تبلیغِ اسلام قاری صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ غالباً اس لیے کہ ان کے دل میں احیائے
 مَدّت کی تڑپ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی صحیح تر تعلیم اور اس پر دیانت داری سے عمل مسلمانوں
 کی رفعت کا موجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف
 کیں اور رسائل و اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ بچوں کہ یہ سب کچھ آج سے تیس چالیس برس پہلے کی
 باتیں ہیں اس لیے قاری صاحب کی تنجاویز میں وعن آج نہ قابلِ قبول ہیں نہ قابلِ عمل۔ کیوں کہ اب
 دُنیا بدل چکی ہے۔ تاہم قاری صاحب کی تنجاویز میں اتنی جان اب بھی ہے کہ اگر حکومت کا سُرشتہ
 تعمیرِ نواں کا یہ غور مطالعہ کرے تو وہ بہت سی ایسی باتیں اخذ کر سکتا ہے جو احیائے مِلّت
 میں معاون ہو سکتی ہیں۔

آغا شاعر قزلباش

اللہ کسی کی بنا کر نہ بگاڑے۔ آغا شاعر قزلباش دہلی کی ان بے مثل ہستیوں میں سے تھے جن پر دہلی کو فخر تھا۔ اردو کو فخر تھا۔ ہندوستان کو فخر تھا۔ آغا صاحب شہرت کے پر لگا کر اُڑے تو اوجِ ثریا پر پہنچ گئے اور جب گمے تو تختِ الشریٰ میں اُتر گئے۔ اُنہوں نے بہت اچھا زمانہ دیکھا اور بہت بُرا بھی۔ ان کی جوانی قابلِ رشک تھی اور بڑھاپا نمونہٴ عبرت۔ جوانی میں بڑے کلمے ٹھٹھے کے آدمی تھے میدو شہابِ رنگ، کسلی پیشانی، غلانی آنکھیں، جن میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے۔ بڑی بڑی ٹونچیں، گھٹی ہوئی ڈاڑھی، دُہرا ڈیل، جھوم کر چلتے تھے۔ جدھر سے گزر جاتے لوگ انہیں دیکھتے رہ جاتے۔ اس مردانہ حُسن و وجاہت کو آغا صاحب کی رنگین مزاجی نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ بے حد خوش گفتار، اس پر غضب اُن کی شاعری کی دُھوم، لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اور بس محفل میں آغا صاحب بیٹھ جاتے وہاں پھر کسی کو بھی دم مارنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اُن کا اندازِ کُل افسانوی گفتار سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتا تھا۔ شعرِ خوانی کا انداز بھی سب سے جداگانہ تھا۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس نے فیصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کو نہ سنا ہو، افسر الشعر آغا شاعر قزلباش کو سُن لے۔ داغ تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ہاں آغا صاحب کو متعدد بار مشاعروں میں سُنانے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ ان سے بہتر تحتُ اللفظ میں کسی کو پڑھتے نہیں دیکھا۔ آواز میں وہ کڑک دھمک تھی کہ بڑے سے بڑے مشاعرے میں بھی اُن کی آواز آخر تک پہنچ جاتی تھی۔ (اُس زمانے میں مائیکروفون نہیں تھا) اپنا کلام سُنانے سے پہلے آغا صاحب اپنے استاد کے دو ایک شعرِ نیر کا ضرور سُنایا کرتے تھے شعر کی ادائیگی اس طرح کرتے تھے کہ خود شعر کی تفسیر بن جاتے تھے۔ اُن کا لب و لہجہ شعر کے مفسرِ مضمون

سے اس قدر ہم آہنگ ہوتا تھا کہ شعر میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور سننے والے تڑپ اٹھتے تھے۔

آغا صاحب کی آشفتمزاجی اور سیما و دشنی انھیں چین سے کہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ابھی دلی میں ہیں ابھی لاہور میں، ابھی حیدرآباد دکن میں ہیں ابھی جھالا وار میں۔ ابھی بمبئی میں ہیں اور ابھی کلکتے میں۔ دلی دلی والوں کو کم ہی اس آتی ہے۔ آغا صاحب بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد گھر کا ماحول بگڑ چکا تھا۔ آغا صاحب ہمیشہ کے لیے نوکیلے تھے۔ بھلا سوتیلی ماں کے طعنے تشنہ ٹھنڈے پیٹوں کیسے سہہ لیتے؟ گھر سے نکلنے کے بعد بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر نامساعد حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ہی ان کی شاعری نے پُر پُر زنی نکالے اور اہل ذوق ان کی قدر دانی کی طرف مائل ہوئے۔ خوب جوان تھے جب کچھ عرصے کے لیے اپنے استاد کے پاس حیدرآباد چلے گئے تھے۔ استاد کی قربت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ فصیح الملک کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تھی مگر استاد کا رنگ جتنا چوکھا آغا صاحب کی شاعری میں آیا، ان کے اور کسی شاگرد کو میسر نہیں ہوا۔ وہی شوخی، وہی چلبلا پن، وہی معاملہ بندی، وہی سادگی، وہی بے ساختگی آغا صاحب کے کلام میں بھی دیکھ لیجیے۔ دلی کا روزمرہ اور چٹخارہ اپنے استاد کی طرح آغا صاحب کا بھی امتیازی وصف ہے۔ ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی۔ ادھر داغ نے غزل کہی اور ادھر آربابِ نشاط کے کمروں اور کوٹھوں پر پہنچی۔ عین عین یہی کیفیت آغا صاحب کی غزلوں کی بھی تھی کہ محفلیں اور مجرے ان سے گونجتے رہتے تھے۔ میرے بچپن میں یہ غزل ہر محفلِ نشاط میں گائی جاتی تھی، مطلع تھا یہ

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ صورت کیوں بنی غم کی

تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

یہ غزل میں نے حیدرآباد میں بھی سنی تھی اور دلی میں بھی، اور اتنی بار سنی تھی کہ اس کے کسی شعر مجھے یاد ہو گئے تھے۔ کوئی بچپن سال کے بعد اتفاقاً معلوم ہوا کہ یہ غزل آغا صاحب کی ہے۔ اگر ملا واحدی صاحب اپنی زندگی کا ایک واقعہ تحریر نہ فرماتے تو شاید مجھے اس کا علم بھی نہ ہوتا کہ یہ غزل کس کی ہے۔ اپنی جانم میں اسے داغ ہی سے منسوب کیے رہتا۔ واحدی

صاحب نے اس غزل کی شانِ نزول بھی اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں لکھ دی تھی۔
 دکن میں آغا صاحب مہاراجہ کرشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے یہاں
 انہیں ہر قسم کا آرام میسر تھا مگر دلی کی یاد نے دل میں چٹکی لی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے۔
 آغا صاحب اپنی آشفتمہ مزاجی سے مجبور تھے، ساری عمر کہیں بھی ٹک کر نہیں رہے۔ عجیب
 توکل کے بندے تھے۔ لگی لگائی روزی پر لات مار کر الگ ہو جاتے تھے۔ ابھی کسی رئیس کی
 مصاحبت میں ہیں اور ابھی اس سے اکتا کر کسی اخبار میں کام کرنے لگے۔ وہاں سے جی گھبرایا
 چھوڑ چھاڑ کر کلکتہ چلے گئے اور تھیٹر کے ڈرامے لکھنے لگے۔ آغا محرم شاہ حشر نے اس صنف
 میں ان کا لوہا مانا، اور آغا شاعر کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اپنا نام مختصر کر کے آغا حشر
 لکھنا شروع کر دیا۔

آغا صاحب کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ دنیا ہی سے بے زار ہو گئے
 تھے۔ گلے میں گیر و اکفن ڈالے ننگے سر پھرنے لگے تھے۔ ایک دن بستی نظام الدین میں خواجہ
 حسن نظامی کے ہاں پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب نے آغا صاحب کی طرح دار جوانی دیکھی تھی،
 اور انہیں کینچلیاں بدلتے بھی دیکھا، اب جو انہیں اس چولے میں دیکھا تو بے اختیار خواجہ
 صاحب کے منہ سے نکلا۔ "آئیے دل دار شاہ داتا" اس کے بعد خواجہ صاحب سے ان کی
 گاڑھی چھینی اور خواجہ صاحب ہی کے کہنے پر مستحرا گئے اور ویدانت کی تعلیم حاصل کی۔ مگر گھبلا
 ہو آشفتمہ مزاجی کا، کچھ دنوں بعد ترکِ دنیا ترک کر کے پھر دنیا کے ہنگاموں سے نبرد آزما بنی
 کرنے لگے۔

آغا صاحب نے کسی مدرسہ سے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ زبان تو ان کے گھر کی
 لونڈی تھی۔ جامع مسجد کے چوک نے اُسے اور بھی بنا سنوار دیا تھا۔ طباع اور ذہین آدمی
 تھے۔ انہوں نے جو کچھ سیکھا، نامساعد حالات سے سیکھا۔ ناسازگار زمانے سے سیکھا کسی کے کہنے
 سننے سے نہیں، اپنی کوشش اور جدوجہد سے سیکھا اور ایسا سیکھا کہ شہرت اور نیک نامی حاصل
 کی۔ شہرت پر ایک واقعہ یاد آیا۔ آغا صاحب سے جب پہلی بار مجھے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور
 اب اس بات کو ربعِ صدی ہو گئی) تو آغا صاحب نے فرمایا تھا۔ "کبھی جوانی میں دلی کے

ایک بوہری کے سلسلے میں ایک مضمون میں میں نے "چھیجنے" کا لفظ لکھ دیا تھا، اس نے مجھ پر اہانت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اُس وقت میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ انہیں دکھائی بھی کم دینے لگا تھا۔ میں نے نام عرض کیا فرمایا۔ "اوہو، تمھاری شہرت تو میرے کانوں میں گھسی جا رہی ہے" میں نے عرض بیان کی تو متبسم ہوئے۔ کہا۔ "تم نے بوہری کی رعایت سے "چھیجنے" لکھا۔ اس سے تہنک نہیں ہوتا۔ عدالت میں میں نے ڈپٹی صاحب کی سند پیش کی اور مقدمہ خارج ہو گیا۔"

نظم میں تو آغا صاحب اپنے ہم عصروں میں سرفہرست تھے ہی، نثر میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ دلی کی نکسالی زبان اور تنٹالی محاورے لکھتے تھے۔ انھوں نے بے شمار مضامین لکھے، ناول لکھے، ڈرامے لکھے، مگر افسوس کہ اب ان میں سے کوئی دستِ یاب نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک رسالہ "آفتاب" بھی کئی سال تک نکالا تھا۔ وہ بھی ماضی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ خواجہ حسن نظامی جیسے انشا پرداز کو آغا صاحب کی نثر کے فقرے کے فقرے آزر تھے۔

آغا صاحب نے اپنی زندگی میں ہزاروں مہینے لاکھوں شعر کہے اور یقیناً ان کے کئی مجموعے بھی چھپے ہوں گے مگر افسوس کہ انھوں نے کوئی دیوان خاص اہتمام سے شائع نہیں کیا۔ ان کے مشہور استاد بھائیوں میں سے نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی نے "کشکولِ سائل" شائع کیا۔ منشی وحید الدین بجنورد دہلوی نے "دُرِ شہوارِ بجنورد" شائع کیا۔ نوح ناروی نے "طوفانِ نوح" شائع کیا۔ آغا صاحب کی اشفقتہ مزاجی اور لاابالی پن نے انہیں اپنے کلام کی تدوین کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

آغا صاحب کو ترجمہ کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ رباعیاتِ عمر خیام کے منظوم ترجمے کئی دیکھنے میں آئے مگر آغا صاحب کے ترجمے سے کسی کا ترجمہ لگا نہیں کھاتا۔ انگریزی میں فٹنر جیرلڈ کے ترجمے کو عالم گیر شہرت حاصل ہے، مگر اسے تو سرے سے ترجمہ کہنا ہی غلط ہے۔ اسے اُخذ، ماخوذ جو جی چاہے کہہ لیجیے، ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ اردو میں بہترین ترجمہ آغا صاحب ہی کا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آغا صاحب کے گھر میں فارسی اُسی نے تکلفی سے بولی جاتی ہے جیسے اردو، لہذا فارسی کی فہم جتنی انہیں تھی، کم لوگوں کو تھی۔ رہی اردو، تو وہ گھٹی میں پڑی تھی۔ شاعر وہ پیدا ہی

ہوئے تھے، بھلا ان سے بازی کون لے جانا؟

آغا صاحب کا ایک اور کارنامہ ان کا منظوم ترجمہ کلام مجید ہے۔ جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے آغا صاحب کو لکھا تھا۔ ”آپ نے کلام اللہ کو نظم کر لیا۔ اب کوئی اللہ کا بندہ اسے طیلے اور سازنگی پر گکا بھی دے تو مرزا آجائے“ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب سے پہلے اور آغا صاحب کے بعد بھی چند اور قادر الکلام شعرا نے کلام مجید کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ مگر آغا صاحب کا ترجمہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ بے شک آغا صاحب افسر الشعرا تھے۔ شاعری کے تاجدار تھے۔ یہ ترجمہ ان کا توشہ آخرت ہے اور ان کی معرفت کا ذریعہ۔

آغا صاحب کی جوانی پر تو دنیا کو رشک آتا تھا۔ ادھیڑ عمر بھی اچھی خاصی گزری مگر بڑھاپا خراب ہو گیا۔ جس ریاست میں آغا صاحب کی کمان چڑھی ہوئی تھی اس کا رئیس مر گیا۔ اور آغا صاحب دل برداشتہ ہو کر دلی چلے آئے۔ اس وقت وہ ستر کے پیٹے میں اچکے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا اور ناداری نے چھاؤنی چھالی مٹھی۔ کچا سا تھ تھا۔ بچے کمانے دھمانے کے لائق نہیں ہوئے تھے۔ آغا صاحب کے دوست احباب اور قدر دان بہت کچھ دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ آغا صاحب کی آنکھ کا آنسو کسی وقت نہیں ٹھمتا تھا۔ جامع مسجد کو دیکھتے تو ہائے کا نعرہ لگاتے اور آنکھوں سے لڑیاں بندھ جاتیں۔ کسی پُرانے خاندان کے فرد کو دیکھتے تو گلے لگا کر بسکیاں بھرنے لگتے۔ دلی اور دلی والوں کا عم انھیں کھائے جاتا تھا۔ یہی دلی تھی جس میں آغا کا طوطی بوتا تھا۔ اب وہی بھری پُری دلی ان کے لیے ویران ہو چکی تھی۔ ہر وقت چمکنے والا طوطی منقار زیر پر تھا۔ آغا صاحب جتنے طرح دار اور وضع دار تھے، اتنے ہی غیور بھی تھے۔ کسی سے امداد قبول نہیں کرتے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا۔ دلی میں ان کے اعجاز کے بہت سے قصے مشہور تھے۔ مثلاً ایک قصہ یہ سننے میں آیا کہ اجیر شریف کے عرس میں ان کی جیب میں سے دو سو روپے کہیں گر گئے۔ سخت پریشان تھے کہ ان کے ایک دوست مل گئے۔ انھوں نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“ آغا صاحب نے کہا۔ ”دلی جاؤں گا۔“ بولے۔ ”یہ دو سو روپے میرے گھر دے دینا۔“ آغا صاحب نے روپے لے لیے اور بلا ٹکٹ

ہی ریل میں سوار ہو گئے۔ ریل فرارٹے بھردہ ہی تھی کہ ایک ہاتھ گھڑکی میں سے اندر آیا۔ اس میں آغا صاحب کا بیٹوہ تھا۔ آغا صاحب نے بیٹوہ لے لیا اور کھول کر دیکھا۔ اس میں دو سو روپے بھی موجود تھے اور ٹکٹ بھی۔ اور جب دوست کے گھر جا کر کنڈی بجائی تو دوست صاحب خود گھر میں سے نکلے چلے آئے۔ آغا صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ ”آپ؟ آپ تو اجیر تشریف میں تھے۔“ انہوں نے کہا۔ ”یس تو یہیں ہوں، اجیر کیسا؟“ آغا صاحب نے کہا۔ ”آپ وہاں بازا میں ملے، یہ دو سو روپے آپ نے مجھے گھر پہنچانے کے لیے دیے،“ دوست نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا کہ آغا صاحب کسی اور عالم میں تو نہیں ہیں؟ مگر وہاں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ کہا۔ ”آپ کو دھوکا ہوا، نہ تو میں اجیر گیا اور نہ میں نے آپ کو روپے دیے۔“

آغا صاحب نے جب ہوگ لے لیا تھا تو اس زمانے میں بھی کچھ غیر معمولی باتیں ان سے ظہور میں آنے لگی تھیں اور شاید انہیں سے گھبرا کر آغا صاحب نے ہوگ کو سچ دیا تھا۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ بڑے وقت میں غیب ہی سے آغا صاحب کی امداد ہوتی تھی، کسی بندے بشر کا ہباؤ نہیں پڑتا تھا کہ انہیں کچھ دے ے

خاکسار ان جہاں را بہ حقارت منگر

نوجہ دانی کہ دریں گورد سوار سے باشد

آغا صاحب کا آخری وقت دلی میں اپنے گھر پر ہی گزرا، اور ایک دن سنا کہ آغا صاحب قید حیات سے چھوٹ گئے۔ اچھے آدمی تھے، اچھی گزار گئے۔ جانا کبھی کو ہے ع
آج وہ کل ہماری بادی ہے

بڑی ناسمجھ شناسی ہوگی اگر بیگم آغا کا ذکر نہ کیا جائے۔ ایسی صابر و شاکر خاتون کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آغا صاحب کی زندگی جس شکل سے گزری، اس کی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی۔ بیگم آغا ہی نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس سیاق سے کی کہ آج بفضلہ تینوں لڑکے بیک روز گار اور خوش حال ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی اپنے گھر بار کی ہے۔ شعر گوئی سب کو ورثے میں ملی ہے۔ مگر سب سے زیادہ اس بچی کو جو سحاب تخلص کرتی ہے۔

اپنے نامی گرامی باپ کی طرح نثر بھی خوب لکھتی ہیں ماشاء اللہ۔ ان چاروں بہن بھائیوں سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ دلی کا روایتی حسنِ اخلاق، بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ، خوش خوش کلام، خوش صفات، یہ عطیہ ہے بیگم آغا کا۔

آغا سر خوش سنجھے صاحب زادے ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں مگر سناتے نہیں۔ نمود سے گھبراتے ہیں۔ رسالہ چمنستان "دلی سے نکالا تھا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ کراچی آکر بھی اسے جاری رکھا۔ مگر ناہموار حالات کی بادِ سموم میں ادب کا یہ چمن اُبڑ گیا۔ آغا صاحب کی دو چار کتابیں بھی چھاپ چکے ہیں۔ اب انہوں نے ایک مجموعہ مضامین مرتب کیا ہے جس میں وہ تمام مضامین جمع کیے ہیں جو آغا صاحب پر لکھے گئے۔ لکھے تو اس سے بھی کہیں زیادہ گئے ہیں، مگر جتنے انہوں نے یک جا کر لیے ہیں، یہ بھی بہت قابلِ قدر ہیں۔ زمانہ زود فراموش اور بڑا ناگننا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے آغا صاحب کی ایک یادگار تو قائم ہو سکے گی۔ ان کی سعادت مندی سے توقع بھی یہی تھی۔

نام نیکِ رفت گاہ ضائع مکن

تا بس اند نام نیکت برقرار

کرشن چندر

تیس سال سے زیادہ ہی ہو گئے کہ "ادبی دنیا" اور "ہمالیوں" میں ایک نئے ادیب نے افسانے لکھنے شروع کیے۔ ان افسانوں کا اندازہ اتنا دلکش ہوتا تھا کہ پڑھنے والے اُن کے لیے چشمِ براه رہنے لگے۔ یہ افسانہ نگار تھا — کرشن چندر۔ جس نے اپنے پہلے افسانے ہی سے ہر دل عزیز ہی حاصل کر لی تھی۔ یہ نثر کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

قیامِ پاکستان سے پہلے دہلی، لاہور گھر آنکھن تھا۔ رات کو کھانا دانا کھا کر فرنیٹیو میل میں جا سوئے اور صبح ہو آنکھ کھلی تو لاہور۔ دہلی کے بعد سب سے زیادہ دخل میری زندگی میں لاہور ہی کو رہا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے لاہور اُس زمانے میں ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو ولایت میں کیمبرج یا آکسفورڈ۔ اس وقت فیشن کے لحاظ سے لاہور کو ہندوستان کا پیرس سمجھا جاتا تھا۔ اور واقعی میں شام ہوتے ہی لاہور کی سال پر قدر آدم قیامتیں برپا ہو جاتی تھیں۔ ایلو! میں بھی مہک کر کہاں سے کہاں جا پہنچا۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو اس لاہور میں میری کالج کی تعلیم کے چار سال گزرے۔ پھر چند سال بعد جب میں نے "ساقی" شائع کرنا شروع کیا تو لاہور کے سال میں کئی کئی پھیرے ہوتے تھے۔ لاہور کی علمی و ادبی زندگی اپنے عروج پر تھی۔ رسالوں میں نیرنگ خیال، عالم گیر، ہمالیوں، ادبی دنیا اور شاہکار اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ شہر ادب کی منڈی اور ادیبوں کی کھان تھا۔ اس شہر میں دوچار مہینے، دس بیس مہینے، سیکڑوں شاعر اور ادیب رہتے تھے۔ اگر میں صرف اُن کے

نام گنا شروع کر دوں تو کسی صفحے پھر جائیں گے۔ اس زمانے کو ہر لحاظ سے لاہور کا سُہرا
 زمانہ کہنا چاہیے۔ لاہور کی وہ طُرنگی اس کے بے مثل بسنے والوں کے باعث ممتی۔ وہ لوگ ہم
 سے رخصت ہوئے اور اس شہر کی شان و شوکت بہت کچھ اپنے ساتھ لے گئے۔

وے سورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

دوسری عالمگیر جنگ سے چند سال پہلے اس لاہور میں لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ

آئی جیس میں میراجی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک ایک دم
 سے چمک اُٹھے۔ علامہ تاجور سے "ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا تھا مولانا
 کی مقناطیسی شخصیت کے گرد نئے ادیبوں اور شاعروں کا ایک حلقہ اسی طرح بن گیا تھا جیسے
 چاند کے گرد ہالہ۔ مولانا خود صاحبِ طرز ادیب تھے مگر بہت کم لکھتے تھے۔ ہاں بہت بڑے
 ادیب گوتھے۔ نئے لکھنے والوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اور جس میں ذرا بھی جان دیکھتے،
 لکھنے میں اس کی راہ نمائی کرتے اور اُس کے مضامین کی اصلاح کر کے "ادبی دنیا" میں چھاپتے۔
 "ادبی دنیا" میں کسی کے مضمون کے چھپ جانے کا یہ مطلب تھا کہ وہ لکھنے والا مستند ادیب
 بن گیا۔ مولانا کی خوش مزاجی اور اُن کی مونسچوں میں چھپی ہوئی دامنی مسکراہٹ نئے لکھنے والوں
 کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ مولانا بڑی محبت و خلوص سے انہیں ادب و انشا کے نکات سمجھاتے
 اور اُن کی خاطر تواضع کرتے۔ اس موانست کے باوجود مولانا کی شخصیت میں کوئی ایسی
 بات تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے بے تکلف ہو جائے۔ مولانا انہیں ایک "مُحترم
 فاصلے" پر رکھنا خوب جانتے تھے۔ لہذا سبھی مولانا کا ادب کرتے اور انہیں اپنا شفیق
 بزرگ سمجھتے تھے۔

مولانا کی ادارت میں "ادبی دنیا" اپنے عروج پر تھا کہ حسبِ معمول میں ایک سال لاہور

گیا۔ مولانا کو خبر ہوئی تو مجھے اپنے دفتر میں شام کی چائے پر بلایا۔ مولانا سے تنہائی میں خوب
 کھل کر باتیں کرنے کے ارادے سے جب میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں اُن کے احباب کا ایک
 خاصا بڑا مجمع لگا ہوا ہے۔ مولانا نے فرداً فرداً سب کا مجھ سے تعارف کر لیا۔ جب اُسوں

نے کوشن چندر کا نام لیا تو میرا دل زدر سے دھڑکا اور میں نے بڑی گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملایا۔ یہ کوشن چندر میرے تصور کے کوشن چندر سے بہت مختلف نکلے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ چھ فٹ لمبے تڑپے بڑے جڑب۔ ان جوان ہوں گے۔ مگر وہ کسی قدر پستہ قد اور خاموش آدمی تھے۔ چہرے سے سنجیدگی اور بردباری ٹپکتی تھی۔ بولنے کے مگر دوسروں کی باتوں پر مسکراتے اور سننے زیادہ تھے پہلی ملاقات میں ان سے بات کرنے کا موقع نہیں۔۔۔ واپس دلی آنے کے بعد ان سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا اور انہوں نے "ساتی" کے لیے ایک افسانہ "ینلی شلوار" بھی بھیجا۔ خطوں سے بہت مخلص آدمی معلوم ہوتے تھے اور بعد میں میں نے انہیں سرتاپا اخلاص پایا۔

جب دوسری عالم گیر جنگ چھڑی تو کئی ادیبوں کی قسمت کھلی۔ وہ یوں کہ آل انڈیا ریڈیو کو بڑے پیمانے پر پروپیگنڈا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد ایک ایک کر کے کئی بڑے ادیب اس خدمت کو انجام دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل تھے جو کھلم کھلا کمیونسٹ تھے، اور وہ بھی جو فسادنگی راج کے شدید مخالف تھے اور بعض نے تو حد ہی کر دی کہ جھٹ کینچلی بدل کر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مجید ملک، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، عارف، چترانگ حسن حسرت اور بدر الدین بدر، کرنل، میجر اور کپتان بن گئے۔ ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے والوں میں کوشن چندر، بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، محمود نظامی، انصار ناصری، شوکت منٹو، سریندر ناتھ چٹو پادھی، (سر و جینی نائیڈو کے بھائی) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر محمود حسین، راز مراد آبادی، حامد علی خاں اور میراجی تھے۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) تو ڈاکٹر جبریل ہی تھے۔ ان میں سے دو ایک کے سوا باقی سب دلی ہی میں تھے۔ اسی زمانے میں مجھے ان سب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پیسے کی فراوانی نے بڑے بڑوں کے جھال کھو دیے تھے۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑ گیا تھا۔ نتیجہ معلوم!

مگر جنہوں نے اپنی سنجیدگی اور بردباری کو نہیں چھوڑا، اور اپنی اٹھی روش ہی پر قائم رہے ان میں سے ایک کوشن چندر تھے۔ دلی آتے ہی وہ ایک شام کو کتب خانہ علم و ادب اردو بازار میں مجھ سے ملنے آئے۔ جس تکلف سے پہلے دن ملے تھے، آخری دن تک اسی تکلف سے ملتے رہے۔

ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت رہا۔ میں اُن کے ہاں اور وہ میرے ہاں کھانے میں اکثر شریک ہوتے رہے لیکن تکلف کی حد برابر قائم رہی۔ وہ لیے دیتے رہتے تھے اور کم گو تھے۔ اُن میں ایک وقار تھا جو اُن کی عزت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ خلیفہ الحاکمی اور اوجھاپن ان میں نام کو نہیں تھا۔ اُن کے ملنے کا انداز بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ اوروں کی زبانی اُن کے بارے میں بُری بُری باتیں سنیں۔ اس کان سنیں اُس کان اُٹھیں۔ یار کی یاری سے غرض یار کے فعلوں سے کیا کام؟ نفسیں انگڑبندی باس پہنتے تھے۔ دھوتی پہنے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ اُن کے افسانوں میں سے بُوئے پوری کچوری آتی تھی اور نہ نود اُن میں سے۔

ریڈیو کے افسر کمرشن چندر سے کچھ خوش نہیں تھے۔ کیوں کہ انھیں چاہیوسی اور خوشامد کرنی نہیں آتی تھی۔ انھیں اپنے کام سے کام تھا۔ دفتری فرائض وہ پوری جان فشانی سے انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد افسروں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ اپنا جی بہلاتے تھے اور اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے اوپر والوں کو یہ بدگمانی ہو چلی تھی کہ کمرشن چندر بہت مغرور آدمی ہے۔ ہم نے اسے ریڈیو میں جگہ دی ہے اور یہ ہمیں کو گھاس نہیں ڈالتا۔ ہمارے متنوسلین تو ہم سے ملنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں اور کمرشن چندر ہے کہ ہم سے دُور ہی دُور رہتا ہے۔ افسروں کی اس شکایت کا علم کمرشن چندر کو بھی ہو گیا تھا مگر انھوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ کسی نے اگر انھیں بتایا بھی تو انھوں نے صاف جواب دے دیا کہ میرا ان سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تو میں ان سے کیوں ملیوں؟ نتیجہ یہ کہ ان کے بعض خوشامدی ساتھیوں کو ترقی مل گئی اور کمرشن چندر پر دو گرام اسسٹنٹ کے پروگرام اسسٹنٹ ہی رہے۔

ایک دفعہ ان کے ہم چشموں نے انھیں بہت سمجھایا سمجھایا کہ پطرس ڈائریکٹر جنرل ہی نہیں ہے، بہت بڑا ادیب اور ایسوں کا قدر دان بھی ہے، اگر تم ان سے مل کر دو باتیں کر لو تو اس میں کیا تخریب ہے؟ وہ اچھے آدمی ہیں۔ سب سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ تم سے مل کر خوش ہوں گے اور تم بھی ان سے مل کر خوش ہو گے۔ لوگوں نے ناحق انھیں ہوا بنا رکھا ہے۔ تم جا کر تو دیکھو۔ غرض باروں نے گونہ گانہ کے کمرشن چندر کو آمادہ کر لیا اور ایک دن کئی زینے لے کر کے کمرشن چندر ڈائریکٹر جنرل کے کمرے کے آگے جا کھڑے ہوئے۔ چپراسی کے ہاتھ اپنے نام کی پرچی اندر بھیجی۔ فوراً بلا لیے گئے۔ جا کر

آداب عرض کیا اور کھڑے رہے۔

پطرس (کُرسی کی طرف اشارہ کر کے) "تشریف رکھیے!"

کرشن چندر: "جی" (بلیٹھ گئے)۔

(خاموشی)

پطرس: "قرایئے؟"

کرشن چندر: "جی — جی آپ — آپ بڑے اچھے ہیں۔"

پطرس: (مُسکرا کر) "میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ٹھیک ہے۔"

کرشن چندر: (کھڑے ہوتے ہوئے) "اجازت ہے؟"

پطرس: "ضرور ضرور۔"

ملاقات ختم ہو گئی۔ کرشن چندر باہر آئے تو جیسے ان پر سوجھوتے پڑ گئے ہوں۔ لڑکھڑاتے

ہوئے زینے پر سے اُترے۔ احباب ان کے منتظر ہی تھے، ٹوٹ پڑے۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" ناراض ہو کر بولے۔ "ہوتا کیا؟ کہا تھا کہ مجھے مت بھیجو۔ مگر آپ لوگ مانے نہیں۔ پوچھا۔ آخر ہوا کیا؟" بولے: "یہ ہوا!" سب نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ کرشن چندر بھی کھسیانی ہنسنے لگے۔

کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے باعث بہت جلد شہرت حاصل کر لی تھی مگر انہیں نہ تو اپنی شہرت کی پروا تھی اور نہ مقبولیت کا زعم۔ ان کی کسی بات سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اپنی بڑائی کا پندار ہے۔ باتیں بھولی بھولی کرتے اور نظریں جھکائے رہتے۔ ان کی تخریب جتنی جان داہ ہوتی تھی، ان کی گفتگو اتنی ہی بے جان ہوتی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مگر بات چیت میں مغربی مصنفین کے حوالے دے کر سُنتے والوں کو مرعوب نہیں کرتے تھے۔ ان کی آواز نیچی اور لہجہ متین ہوتا تھا۔ جو بات کہنی ہوتی، سیدھے سبھاؤ کہہ دیتے۔ میں نے ان کی زبان سے عربی یا فارسی کا کوئی مشکل لفظ کبھی نہیں سنا۔ اُردو بولتے تھے تو اُردو ہی بولتے تھے۔ اس میں انگریزی نہیں ملاتے تھے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ کئی سال کی کجائی کے باوجود انہیں انگریزی بولتے کبھی نہیں دیکھا۔ حالاں کہ وہ انگریزی ہی کے ایم اے تھے اور اُنہوں نے

لاہور کے فورمن کر سچین کالج میں پڑھا تھا جس کے پروفیسر امریکن تھے۔ مگر لکھنے کے معاملے میں انگریزی بھی اتنی ہی خوب صورت لکھتے تھے جیسی کہ اردو۔

کرشن چندر نام و نمود سے گھبراتے تھے۔ وہ شہرت سے بھاگتے تھے اور شہرت ان کے پیچھے بھاگتی تھی۔ نمود سے گریزاں ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں دوسری عالمگیر جنگ زور پکڑ رہی تھی اور جاپان نے برما پر قبضہ کرنے کے بعد کلکتہ پر بھی دو چاریم گرا دیے تو کوشن چندر کے دل میں یہ آئی کہ اب واقعی ہندوستان کے سب ادیبوں کو اپنی پالیسی بدل دینی چاہیے۔ اب تک تو انگریز دشمنی تھی اور ہندوستانی برہمنی اور جاپان کی پیش قدمیوں پر دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن دوست! لیکن جاپان کی جارحانہ حرکت نے باور کرا دیا کہ یہاں معاملہ برعکس ہے، یعنی دشمن کا دشمن بھی دشمن! لہذا ہماری خیر اسی میں ہے کہ سب کو اپنا دشمن سمجھیں اور صرف اپنی خیر منائیں۔

ایک دن کرشن چندر نے برٹش رازداری سے مجھ سے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام زبانوں کے معروف ادیبوں کا ایک کنونشن دہلی میں بلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں پورے ہندوستان کے ادب کا رخ کیا ہونا چاہیے۔ پھر ہمیں چند ضروری قراردادیں منظور کرانی ہوں گی۔ میں نے کہا: "تو یہ جلسہ ضرور بلانا چاہیے۔ آپ پیننوالی کیجیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" یو لے: "مہنیں، کنوینئر آپ ہوں گے اور وات سیان" میں نے پوچھا: "یہ وات سیان کون صاحب ہیں؟ کیا سدر اسی ہیں؟" کہا: "ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔" میں نے کہا: "کنوینئر تو آپ کو ہونا چاہیے۔ آپ کو اردو والے بھی جانتے ہیں اور ہندی والے بھی۔" یو لے: "مگر آپ غیر جانب دار ادیب ہیں اور ایڈیٹر ہیں، اور دہلی ہی کے رہنے والے ہیں اور حکومت کے ملازم بھی نہیں ہیں۔ اس کام کے لیے آپ سے موزوں آدمی ہمیں اور کوئی نہیں مل سکتا۔" اپنی تعریف سن کر سبھی پھول جاتے ہیں، میں بھی پھول گیا اور جھٹ رنما منہ ہو گیا۔ ایک ہفتے ہی میں کنونشن کا پروگرام چھپ کر آ گیا، اور دعوت نامے بھی۔ مجھے مہنیں معلوم کہ اخراجات کے لیے روپیہ کہاں سے آیا؟ کس کو کیا دیا؟ سارے کام سدھ کیسے ہوتے چلے گئے؟ دو ہفتے بعد بھانت بھانت کے مہمان ادیب آنے

شروع ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں کہاں ٹھہرایا گیا۔ سو سے کیا کم ہوں گے۔ بیشتر اپنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بارڈنگ لائبریری کے ہال میں دو دن تک شان دار جلسہ ہوا۔ دھواں دھارا تقریریں ہوئیں، پیپر پڑھے گئے اور قراردادیں منظور کی گئیں۔ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ سب کام بغیر کسی پریشانی کے ہوتے چلے گئے۔ سب نے مجھے جلسے کی کامیابی کی مبارکباد دی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ کرشن چندر کی محنت کا پھل مجھے مل رہا ہے۔ کرشن چندر کھلے جاتے تھے اور میری تعریف کے پل بانڈھے جاتے تھے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑتا رہا اور میں کھسبانی ہنسی ہنستا رہا۔ بعد میں میں نے کرشن چندر سے کہا کہ ”آپ نے اس جلسہ کی کامیابی اور نیک نامی کا سہرا میرے سر بانڈھ دیا۔ سارا کام تو آپ نے کیا اور نام میرا ہو گیا۔“ مسکرا کر بولے۔ ”سب ٹھیک ہے، اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے۔“ اور میں نے آج تک اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا، مگر اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس راز کو افشا کر دوں تاکہ حق حق دار کو پہنچ جائے۔

کرشن چندر بڑے خرچیلے آدمی تھے۔ ننواہ کے ڈھائی تین سو روپے شاید دس دن بھی نہیں چلتے ہوں گے۔ کتابیں لکھتے تھے یا مرتب کرتے تھے۔ اور لاہور سے ان کی کتابیں چھپتی رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ ایک دن شام کو کتب خانہ علم و ادب پر آئے۔ احباب حسب معمول جمع تھے۔ کرشن چندر عموماً تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جایا کرتے تھے مگر اس دن جیسے رہے، اور پہلو بدلتے رہے۔ جب دکان بند ہونے لگی اور سب اپنے اپنے گھر جانے لگے تو کرشن چندر نے مجھ سے کہا: ”آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فرمائیے۔“ بولے: ”آپ ان سب سے رخصت ہو لیں تو کہیں چلیں۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ انہوں نے ایڈورڈ پارک کا رخ کیا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے مچھلی والوں میں سے گزر گئے۔ کرشن چندر جیب کچھ نہ بولے تو میں نے کہا: ”فرمائیے، کیا بات ہے؟“ بولے: ”میں ساتھی فیک ڈپو کے لیے ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا: ”ضرور لکھیے، اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“ ہنس کر بولے: ”مگر اس کے لیے مجھے کشمیر جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تو جانیے؟“ کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ناول کا کاپی رائٹ مجھ سے لیں۔“ کرشن چندر کو معلوم تھا کہ جیب سے ایک معروف ادیب نے اپنی ایک کتاب کی رائٹنگ کے سلسلے میں مجھ سے

بدگمانی کی تھی، میں نے رائٹی پر کتابیں چھاپنے سے توبہ کر لی تھی اور دائمی حقوق خریدنے شروع کر دیے تھے۔ لہذا کمرشن چندر نے کاپی رائٹ خریدنے کی پیشکش کی تھی۔ اب گھبرانے کی میری باری تھی کہ اتنا بڑا اور مقبول مصنف نہ جانے کیا مانگ بیٹھے؟ میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ ”آپ کیا قبول کریں گے؟“ بہت ہچکچاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اس کے لیے ایک ہزار روپے دے دیں گے؟“ میری ساری گھبراہٹ رُو چکر ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔“ پھر انہوں نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ ”کیا آپ مجھے یہ روپے پیشگی دے دیں گے؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں دے دوں گا۔“ بولے۔ ”تو جب آپ مجھے یہ روپیہ دیں گے تو میں کشمیر چلا جاؤں گا اور ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”روپیہ آپ کو کل مل جائے گا۔“ بہت خوش ہوئے۔ بولے: ”بس تو میں پرسوں چلا جاؤں گا۔“ پچیس دن بعد وہ کشمیر سے واپس آگئے اور مجھے اپنے ناول ”شکست“ کا مسودہ دے گئے۔ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ ”کمال کر دیا آپ نے!“ کہنے لگے۔ ”روپے ختم ہو گئے تھے اس لیے میں کچھ جلدی واپس آ گیا۔“ پچیس دن میں ایک ہزار خرچ کر دینے پر تو مجھے تعجب ہوا ہی تھا، اس سے زیادہ تعجب کمرشن چندر کی راست معاملگی اور دیانت داری پر ہوا۔ پہلے ادیب تھے جنہوں نے اپنی بات کا پاس کیا تھا ورنہ یاد لوگ بڑے بڑے وعدے کر کے مجھے جھٹکاتے ہی رہے۔ ”شکست“ کے بعد کمرشن چندر نے میرے لیے ”نئے افسانے“ کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا اور اس کے بعد اپنے مختصر مضامین کا مجموعہ ”گھونگھٹ میں گوری جلی“ دیا۔ معاملت میں میں نے انہیں کھرا پایا۔ مول تول نہ انہوں نے کبھی کیا اور نہ میں نے۔ ان کا مطالبہ بہت معقول ہوتا تھا اس لیے سو سے بازی کی توبت ہی نہ آتی تھی۔

”شکست“ شائع ہوئی تو ادبی دنیا میں بھونچال سا آ گیا۔ مدتوں بعد ایک اچھے مصنف کا اچھا ناول شائع ہوا تھا۔ کچھ لوگ ”شکست“ کو دیکھ کر جل گئے اور کچھ رشک و حسد میں گھلنے لگے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر ایک اچھی تنقید لکھی۔ منٹو، اشک، فیض احمد فیض اور چاند حسن حسرت تک ناول لکھنے پر نزل گئے، مگر سب ٹیں ٹیں فیش منٹو نے کہا:

”بس ضرور لکھوں گا۔“ یہی کہتے کہتے بمبئی چلے گئے۔ اشک نے کہا۔ ”میرا ناول کرشن کے ناول سے بہتر ہوگا۔ بس دو ہزار ٹوں گا اور پیشگی ٹوں گا۔“ مجھ میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان سے معاملہ کر لیتا۔ لہذا یہ ناول بھی نہیں لکھا گیا۔ فیض صاحب نے چھ سو روپے پیشگی لیے اور چھ مہینے بعد ٹوں دیا۔ کہ ناول لکھنے کی فرصت نہیں مل رہی جسرت صاحب نے ناول بھی نہیں لکھا اور پیشگی رقم بھی لے کر جنوب مشرقی ایشیا چلے گئے۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد لاہور اور کراچی میں ساہا سال تک ملتے رہے مگر ناول اور پیشگی کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ پھر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد نوکری کے خواہش مند کو اگر آل انڈیا ریڈیو میں جگہ مل جاتی تھی تو امیدوار اسے اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ باہر سے ریڈیو کی دنیا نوجوانوں کو پرستان دکھائی دیتی تھی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کا یہ حسین خواب ٹوٹ جاتا اور وہ محسوس کرنے لگتے کہ ہم کس دھسن میں آن پھنسے؟ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے۔ ہونیکل گیا اچھا ہی رہا۔ اور بعض تو بہت اچھے رہے، جیسے آغا محمد امثرن کہ آگے چل کر ”ہزار ایکسے لیتسی“ کہلائے۔ مگر یہ دوسری عالم گیر جنگ سے پہلے کا ذکر ہے۔ جنگ کے بعد فلم انڈسٹری بمبئی اور پونا میں چمک اٹھی تھی۔ کلکتہ پٹ گیا تھا۔ آغا حشر وہاں سے پہلے چلے آئے تھے۔ اردو لکھنوی بھی بعد میں آگئے تھے۔ منشی پریم چند جب اپنے چھاپے خانے کی وجہ سے بہت مفروض ہو گئے تو مجبور ہو کر بمبئی کی فلمی دنیا میں چلے گئے تھے۔ مگر منشی جی اس میں پنپ نہ سکے اور جلد ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ جوش ملیح آبادی جا کر ڈیلیو۔ زیڈ۔ احمد کی کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ ساغر نظامی بھی وہیں تھے۔ وہاں یہی کہتے تھے کہ کالمے بھی میں لکھتا ہوں اور گانے بھی۔ خیر، ہمیں اس سے کیا کہ کون لکھتا تھا؟ ہمارا کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ بڑا بڑا بقادری فلموں کا رخ کر رہا تھا۔ شاہد لطیف، انجمن ترقی اردو دہلی کو چھوڑ کر بامبے ٹاکنیز میں چلے گئے تھے۔ ان کے بعد عصمت چغتائی بھی پہنچ گئیں۔ احمد عباس پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دتی سے منٹو، اشک، راہ مہدی علی خاں بھی بمبئی پہنچ گئے، اور فلمستان سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے بعد کرشن چندر اور مہندر ناتھ بھی چلے گئے۔ قیسی رام پور، ماہر القادری اور بہزاد لکھنوی بھی فلموں کے چکر میں رہے۔ مگر دیر سویرا کام ہو کر پاکستان آ گئے۔ تشکیل بدالیونی اپنی موزوں اور محتاط طبیعت کی وجہ سے جے رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ علی سردار

جعفری اور خمد بھی بمبئی میں تھے۔ نخشہب جاڑپوی کی ایک توالی نے ان کا مستقبل بنا دیا تھا۔
 جاں نثار اختر، میراجی اور اختر الایمان بھی قسمت آزمائی کو پہنچ گئے تھے۔ اور بھی چند حضرات
 ہوں گے، جن کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ غرض بمبئی میں ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصا
 مجمع ہو گیا تھا۔ علامہ سیلاب پاکستان آگئے تھے اور اعجاز صدیقی صاحب اپنا ماہنامہ "شاعر" آگرہ
 سے بمبئی لے گئے تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ بمبئی میں ادیبوں اور شاعروں کے بھاگ کھل رہے تھے
 بلانے کو تو جو بھی بمبئی پہنچ جاتا مجھے ضرور بلاتا۔ مگر شاہد لطیف اور عصمت چغتائی نے جب اپنا
 گھر جمالیاتویں نے ایک ہفتہ کے لیے بمبئی جانے کی فرصت نکالی۔

دلی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک تازہ شاہد لطیف کو اور دوسرا کرشن
 چندر کو دے دیا تھا کہ میں قلاں تاریخ کو قلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ قیام شاہد لطیف
 کے یہاں ہوگا۔ جب میں بمبئی اسٹیشن پر اُترا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ طبیعت سخت مکدر ہوئی
 جی میں یہی آئی کہ اگلی گاڑی سے دلی لوٹ جانا چاہیے۔ میں دیننگ روم کا رخ کر رہا تھا کہ
 ایک دم سے مہندر ناتھ آکر لیٹ گئے۔ "ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ بھائی نے
 مجھے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لیے" اُدگھٹنے کو ٹھیلنے کا بہانہ، میں ان کے ساتھ ہولیا۔
 کرشن چندر نے اندھیری میں بہت بڑی کونٹھی لے رکھی تھی۔ گھر پر وہ میرے منتظر تھے۔ ہم
 بغل گیر ہوئے۔ مزاج پُرسی کے بعد پہلی بات میں نے یہی کہی کہ شاہد لطیف اسٹیشن پر
 لینے نہیں آئے، اس لیے میں مہندر ناتھ کے ساتھ آپ کے ہاں آ گیا۔ کرشن چندر نے کہا۔
 "اگر شاہد لطیف آ بھی جاتے، تب بھی مہندر آپ کو اور انہیں یہیں لاتا۔" شام کا وقت تھا
 چائے آگئی۔ ابھی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ شاہد لطیف آگئے۔ گھبراہٹ اور ندامت
 سے یوں۔ "مجھے اسٹیشن پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ چلیے، نیچے ٹیکسی کھڑی ہے" کرشن چندر
 کچھ بولنے کو ہوئے تو میں نے کہا۔ "آج تو میں ان کا مہمان ہوں، کیوں کہ یہ مجھے اپنے
 گھر لے آئے ہیں۔ ان کی اجازت سے کل میں آپ کے ہاں آ جاؤں گا" شاہد لطیف نے
 بہت اصرار کیا مگر میں ان کے ساتھ نہیں گیا۔ اُس رات دیننگ روم میں کرشن چندر اور مہندر ناتھ
 سے باتیں ہوتی رہیں۔ کرشن چندر فلموں میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ کہانیاں اور مکالمے

لکھے، پر ڈیو سرینے، ڈائری کٹر بھی بنے مگر قدرِ اول کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکے۔ کرنے بھی کیسے؟
 اپنی مرضی تو چلتی نہیں تھی۔ جو سیٹھ پیسہ لگاتا تھا اس کے اشاروں پر چلنا پڑتا تھا۔ فلمی دنیا میں
 کرشن ہنڈر ریڈیو سے دس گنا زیادہ کماتے تھے مگر روپے پیسے کو انہوں نے ہاتھ کے میل سے زیادہ
 کبھی نہ سمجھا۔ ادھر آیا، ادھر اٹھ آیا۔ ایسے متنوکل بندے بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ فطرتاً وہ ناشاطہ
 تھے۔ "کھاؤ، پیو، موج کرو۔ کیوں کہ کل ہمیں مرنا ہے"۔ ہر ان کا عمل تھا۔ مگر خلوص نیت کی برکت
 بھی کچھ ایسی تھی کہ کبھی انہیں ہنسی دست نہیں دیکھا اور نہ کبھی یہ سنا کہ وہ کسی کے فرض دار ہیں۔
 سدا دس پانچ کو کھلا کر کھاتے تھے۔ مذہب ان کے لیے نہ تو رکاوٹ تھا اور نہ سفارش۔ نام کے
 ہندو تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب سے یکساں ملتے تھے۔

پھر وہ وقت آ گیا کہ انسان، انسان کے خون کا پیا سا ہو گیا۔ جنگل کا قانون نافذ ہو گیا اور
 انسان درند بن گیا۔ ریلیں کٹنے لگیں اور تار اور ڈاک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کسی کو کسی کی
 خبر نہ رہی، اور ایک دن ایک میٹری کا ٹرک ہمارے گھر پر آ گیا اور ہم بھرا پڑا گھر ایک پتہ گزریں
 رشتہ دار کو سو نپ کر ٹرک میں سوار ہو گئے۔ شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس ٹرک نے
 ہمیں پڑانے قلعہ میں اتار دیا۔ یہاں اسی ہزار آدمی پہلے سے موجود تھے۔ چچہ بھیر زمین صاف کر کے
 ہم بھی بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اندھی قسمت کے ہاتھوں ہم کھلونا
 بنے ہوئے تھے۔ پڑانے قلعے میں تین دن ٹیسوس رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدین کے
 ریلوے اسٹیشن پر لے جایا گیا۔ اور ریل کے ڈبے میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔ صبح چھ بجے
 سے رات ایک بجے تک جو جہاں بیٹھا تھا وہاں سے ہل نہ سکا۔ رات کے ایک بجے ایک جھٹکے
 کے ساتھ ریل رُک گئی۔ اندر بھی اندھیرا تھا اور باہر بھی۔ پھر تڑتڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی، اور
 ایک شور برپا ہوا کہ حملہ ہو گیا۔ ڈبے کی ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں۔ گرمی اور جس کے مارے دم نکلا
 جاتا تھا مگر باہر گولیاں برس رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ تک ہم نے اپنی موت کا انتظار کیا، مگر زندگی باقی
 تھی، بچ گئے۔ آدھی ریل حملہ آوروں نے بالکل صاف کر دی تھی۔ خدا خدا کر کے تیسرے دن لاہور
 پہنچے۔ سواصلات کے تمام سلسلے ٹوٹ چکے تھے۔ دہلی کے ایک اخبار نے ریل کے کٹنے اور میرے
 لاپتہ ہو جانے، میرے اور میرے پورے خاندان کے "شہید" ہو جانے کی خبر چھاپ دی۔ وہ اخبار

کوئی اپنے ساتھ لاہور لے آیا اور اس کے حوالے سے اور اخباروں میں بھی یہ خبر چھپ گئی۔ ایک اخبار کا تراشا میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ وہ یہ ہے :

ایڈیٹر ساقی "کا ساتھ" ارتحال
 "آہ! شاہد احمد دہلوی!"

لاہور۔ ۴ نومبر۔ اخبارِ عصرِ جدید نے اطلاع دی ہے کہ یہ خیر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ دہلی کے مشہور ماہنامہ "ساقی" کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی شہید کر دیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ آپ مَح اہل و عیال دہلی سے پناہ گزین اسپیشل ٹرین میں لاہور جا رہے تھے کہ گاڑی پر حملہ ہوا۔ جس میں آپ بھی راہی عدم ہوئے۔ آپ کی موت سے اُردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے اور ہماری دُعا ہے کہ خدا انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

یہی خبر جب بمبئی پہنچی تو میرے احباب بہت رنجیدہ ہوئے اور کرشن چندر نے ایک تعزیتی جلسہ کیا۔ جس میں وہ سب کچھ ہوا جو ایسے جلسوں میں ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے دوستی کا حق ادا کر دیا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں اور وہ خیر غلط تھی تو انھوں نے مجھے ایک بڑا محبت بھرا خط لکھا اور بمبئی میں ایک ایک سے کہتے پھرے کہ شاہد احمد زندہ ہیں، شاہد احمد زندہ ہیں۔ دوست تو بہت ملتے ہیں مگر مخلص دوست کم ہی ملتے ہیں۔ میری پوری ساٹھ سال کی زندگی میں مجھے دو تین سے زیادہ مخلص دوست نہیں ملے۔ ان میں سے ایک کرشن چندر ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار تو ہیں ہی، بہت بڑے انسان بھی تو ہیں۔ (۱۹۶۷ء)

حفیظ جالندھری

یادش بخیر حفیظ جالندھری صاحب ان چند نفوس میں سے ہیں جن کی قدر و وقعت میرے دل میں بہت زیادہ ہے۔ وہ تمام تر خود ساختہ پرداختہ بڑے آدمی ہیں۔ اُنہوں نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے۔ اسکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں تھے کہ اُنہیں عمر روزگار نے مار لیا۔ طبیعت شروع ہی سے شاعرانہ پائی تھی۔ چھوٹا موٹا کاروبار کیا، راس نہ آیا۔ دکان پر بیٹھے، نقصان اٹھایا۔ جیسے ادب و شعر کا چسکا پڑ جائے، وہ اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ کہیں بہن پر گھاس لادی جاتی ہے؟ جالندھری کی فضا میں پوکڑی بھول گئے۔ لاہور سدا سے ادب و شعر کی منڈی رہا ہے۔ خبر نہیں کسی کے مشورے پر باغ شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کا پہنچنا اور پوکڑیاں بھرتا۔ آنا فانا کہیں سے کہیں پہنچے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، قدر دانوں نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ نو صاحب جالندھری کا مارا پڈرا لڑکا لاہور میں آکر ابوالاثر حفیظ جالندھری بن گیا۔ سیتزر کی طرح وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ورنہ اسی لاہور میں کچھلے سو سال میں ایک سے ایک جگادری شاعر آیا اور ٹہل مٹھلا کر چل دیا۔ کسی نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تڑے مُنڈ میں کئے دانت ہیں ے

ابن سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

حفیظ صاحب کے عروج کا یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے پہلے پہل انہیں دیکھا۔
 میں اس زمانے میں ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ ذکر ہے ۲۳-۲۴ء کا۔ ایف سی کالج اس
 وقت وائی ایم سی اے کے پہلو میں تھا۔ جہاں اب بڑی بڑی دکانیں اور دفتر بن گئے ہیں۔
 یاد ہتیں رہا، کیا تقریب تھی، کالج کے ہال میں کئی سولہ کا جمع تھا۔ کالج کا پورا اسٹاف
 مع پرنسپل لوکس کے ڈانس پر سجا ہوا تھا۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب
 تشریف لاتے ہیں۔ اس زمانے میں سابقوں میں "ابو" کی ردیف چل رہی تھی۔ ابوالکلام،
 ابوالکمال، ابوالمعانی، ابوالکارم، ابوالخیر، ابوالمجاہد اور خبر نہیں کیا کیا۔ "ابو" اعلان کے ساتھ
 ہی ایک نوجوان ڈانس پر آ گیا۔ سر پر اونچی باڑ کی توکی ٹوپی، اچکن، چوڑی دار پا جامہ۔ وضع کسی
 طرف سے بھی جالندھری نہیں تھی۔ نہ سر پر کلاہ زریں اور مشہدی، نہ بریس ہاف کوٹ، نہ
 دھڑ میں شلوار۔ گیہواں رنگ، کھلی پیشانی، لمبوتر اچہرہ، چمک دار آنکھیں، کتا راسی ناک،
 خشخشی موشچھیں، داڑھی صفا چٹ، بوٹا ساقہ۔ نازک نازک ریشمین سے آدمی۔ بھلا ایسے
 ہوتے ہیں کہیں جالندھر والے؟

خیر، تو ان صاحب نے پیچھے مڑ کر اجازت لی اور لہک کر آواز لگائی:

"کھاؤں کھاؤں!"

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ اُس زمانے میں مائیکروفون نہیں تھے۔ بارے انہوں نے دوبارہ
 اپنا مصرع پڑھا تو معلوم ہوا کہ کہہ رہے ہیں:۔
 "ابھی تو میں جوان ہوں!"

اس کے بعد جو انہوں نے اپنے نئے انداز کی نظم سنائی شروع کی تو ہال میں جو بڑے بڑے غم
 ہو رہے تھے، سب بند ہو گئی اور ایسا سناٹا چھایا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ مگر
 ادھر نظم کا ایک بند ختم ہوا اور ادھر واہ وا! سبحان اللہ کا شور برپا ہوا۔ نظم خاصی طویل تھی
 اور حفیظ صاحب اس کے مصرعے ایسے چپا چپا کر پڑھ رہے تھے جیسے شاعری کی جگالی کر رہے
 ہوں۔ مگر ان کے ترنم کی طرح ان کے پڑھنے کی یہ خاص ادا بھی بڑی دلبرانہ تھی۔ اس میں تقریباً
 آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر کسی کو وقت کا احساس نہیں ہوا۔

جب نظم ختم کر کے وہ جانے لگے تو بے تماشاً تالیاں سجنے لگیں اور "ایک اور، ایک اور" کی دہی دہی سی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

ڈاکٹر لوکس کا سارے کالج پر اس قدر رعب تھا کہ ان کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اونچی آوازیں بات کر لے۔ حفیظ صاحب نے ٹھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اپنے سر کو مثبت جنبش دی تو حفیظ صاحب نے واپس آ کر جو پوری دُھن میں :

"بسالے اپنے من میں پریت"

سُنا کر شروع کیا۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک نئے انداز کی شاعری تھی۔ کیوں کہ اُس وقت تک ہم نے شاعروں سے اور مشاعروں میں غزلیں ہی سنی تھیں۔ حفیظ نے اُس کے سُنانے کے دوران میں تالوں سے ملتی جلتی آوازیں بھی نکالیں تو میرے کان کھڑے ہوئے۔

"ارے، یہ شاعر تو گویا بھی ہے!"

کلام کی جدت و بے ساختگی اور ترمیم کی موزونیت، دل آویزی نے میرا دل موہ لیا۔ اور اسی وقت سے میں حفیظ صاحب کے خاموش قدر دانوں میں شامل ہو گیا۔

سائنس کے طالب علم کو اتنی فرصت کہاں کہ شاعری اور شاعروں کے چکر میں پڑے۔ مگر بدقسمتی سے ادب و شعر کی چیٹک مجھے بھی لگی ہوئی تھی۔ چور چوری سے جائے گا تو کیا ہیرا پھیری، سے بھی جائے گا۔ کالج کی لائبریری میں اردو کے اخبار رسالے بھی آتے تھے۔ اب میں ادب اور حفیظ صاحب کا کلام ان میں پڑھنے لگا۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی صنف دی تھی، اور یہ صنف مٹی گیت کی۔ حفیظ کی نقالی میں ہندوستان کے ہر گوشے سے گیت لکھے جانے لگے۔ گیت کی ہیئت کے عجیب و غریب تجربے کیے جانے لگے۔ صورت یہ ہو گئی کہ "پیمانہ" یا کسی ایسے ہی رسالے کو اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو اکثر صفحات پر SNAKES AND LADDERS (سانپ اور سیڑھیاں) بنی ہوئی دکھائی دیتیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ خیر سے یہ گیت ہیں، جن کی یہ ہیئت کزانی ہو گئی ہے۔ مگر حفیظ صاحب ہمیں بڑے خوب صورت گیت اور بڑی حسین نظیوں دیتے رہے۔ انہوں نے گیت کے وقت کو قائم رکھا۔

شمس العلماء میر ممتاز علی صاحب مرحوم متھے تو یوپی کے رہنے والے، مگر سچاپس ساٹھ سال پہلے انھوں نے لاہور کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ میر صاحب اور ان کی اہلیہ محمدی بیگم مرحومہ نے مل کر عورتوں کا ہفتہ وار اخبار "تہذیب نسواں" لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ ادبی اخبار غیر منقسم ہندوستان کے ہر شریف خاندان میں آتا تھا، اور اس قدر مقبول تھا کہ تہذیبی بہنوں اور تہذیبی بھائیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ بن گیا تھا۔ محمدی بیگم اچھے معاشرتی اور اخلاقی مضامین اس میں لکھتا کرتی تھیں۔

جب امتیاز علی تاج نے ہوش سنبھالا تو محمدی بیگم نے بچوں کے لیے بھی ایک ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کیا۔ مرحومہ بچوں کے لیے روایتی اور اخلاقی کہانیاں بھی لکھتی تھیں جن میں سے بہت سی کتابی صورت میں چھاپ دی گئی تھیں۔

جب اخباروں اور کتابوں کا کاروبار بڑھا تو میر صاحب نے اخباروں کے لیے اڈیٹر ملازم رکھنے شروع کر دیے۔ ان اڈیٹروں کو آسان اردو لکھنے کی تربیت خود مولوی صاحب دیتے تھے۔ اس ادارے کے تربیت یافتہ اڈیٹروں میں بڑے بڑے نام دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً بیگم نذر سجاد حیدر، سید وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا عبد المجید سالک، نشتہر جالندھری، پنڈت بہری ناتھ اختر، مولانا چراغ حسن حسرت، مشہور افسانہ نگار غلام عباس اور آخر آخر میں حفیظ ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی اور راجہ مہدی علی خاں۔ دور متوسط کے اڈیٹروں میں حفیظ جالندھری بھی شامل تھے۔

میر ممتاز علی صاحب سے میرے والد کے تعلقات مخلصانہ تھے، اور جب میں نے لاہور میں داخلہ لے لیا تو میں بھی کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ریلوے روڈ پر گھر اور دفتر ایک ہی جگہ تھا۔ یہیں میں نے امتیاز، پطرس، سالک، حفیظ جالندھری، غلام عباس، اور چراغ حسن حسرت کو پہلی بار دیکھا۔ مگر یہ جلوہ دور ہی کا تھا۔ حفیظ صاحب کی شہرت اس وقت پر توں رہی تھی۔ عمر و عیار و عیزہ دو ایک کتابیں بھی ان کی دارالاشاعت سے شائع ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا نام شہرت کے پر لگا کر اُس وقت اڑا جب انھوں نے "شہنامہ اسلام" لکھا۔ اور اس کے خاص خاص حصے انھوں نے ایک مخصوص دھن

میں سُناتے شروع کیے اور اُن کا سلام " سلام اسے آمنہ کے لال " تو اتنا مقبول ہوا کہ گھر گھر پڑھا جانے لگا۔ اس شاہنامہ نے انہیں " فردوسی اسلام " بنا دیا۔

لاہور کے شاعر اور ادیب ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور یہ ٹولیاں آپس میں ٹکراتی رہتی تھیں۔ ان کی ٹکڑوں کی وجہ سے ادبی دُنیا میں خاصا ہنگامہ رہتا تھا۔ ایک بڑی ٹولی تو یہی تھی جس کے سرغنہ پطرس تھے اور دارالاشاعت اس کا اڈا تھا۔ انہیں حضرات نے آگے چل کر نیاز مندانِ لاہور " کاروپ دھارا۔ دوسری بڑی ٹولی شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی کی تھی۔ تاجور مرحوم ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے، اس لیے ان کے سیکرڈوں شاگرد تھے خود تاجور بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ ان دونوں ٹولیوں میں آئے دن ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ تاجور کو نیچا دکھانے کے لیے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے بھی نکالے گئے، جن میں سے بعض کی ادارت حفیظ صاحب نے کی تھی۔ تاجور ایک لحیم شمیم انسان تھے، جنہیں دیکھنے کے بعد تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہ کاما پہلوان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح نہیں سمجھا جاسکتا تھا کہ شاعر ہیں۔ مگر مولانا جس قدر گراں ڈیل تھے اسی قدر گراں ڈیل ان کا علم و فضل بھی تھا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے اپنی حریف ٹولی پر بھاری تھے۔ حفیظ صاحب نے میدانِ کارزار گرم کر رکھا تھا۔ مگر تاجور رولر کی طرح اس میدان پر پھر جاتے تھے۔ عجب لوہے کا بنا ہوا آدمی تھا، چومکھی لڑتا تھا اور ڈٹ کر مقابلہ کرتا تھا۔ یہ لڑائیاں آج کل کی لڑائیوں کی طرح گھٹیا اور بے ہودہ نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی ایک وقار اور لطف ہوتا تھا۔ ادب و شعر کے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتیں، دھونٹال میہنہ پڑتا۔ کوہ پیکر بادل ٹکراتے، شورِ قیامت برپا ہوتا، بجلی کے کوڑے بنتے، کبھی کبھی جھڑی بھی لگ جاتی، مگر اکثر یہ ہوتا کہ برس کر کھل جاتا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے طبیعتیں فرحت پانے لگتیں۔ جب تک مولانا لاہور میں رہے، اور آخر وقت تک وہ لاہور ہی میں رہے، یہ مقابلے اور مجاہدے ہوتے رہے اور لاہور کی ادبی رونق کو بڑھاتے رہے۔

حفیظ صاحب کی دیکھا دیکھی تقریباً سبھی شاعروں نے ترم سے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا تھا۔ شاعروں کی جان پر یہ اور غضب ٹوٹا۔ ایک سے ایک بے سُر شاعر ہے کہ گارہا ہے۔

اور میاں تان سبب کی قبر پر لات مار رہا ہے۔ اس کا ردِ عمل ہونا ہی تھا۔ ایس پی ایس کے ہال میں اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایک صاحب جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور گاتے بجاتے بھی خوب تھے اور مولانا تاجور کی فوج میں شامل تھے ایک دفعہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ صاحب پوری طرح مسلح تھے۔ اس مشاعرے میں حفیظ صاحب بھی آنے والے تھے، آگے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے وہ صاحب اسٹیج پر آئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ :

”آج کے مشاعرے میں جو صاحب گا کر اپنا کلام سُنانا چاہیں وہ باقاعدہ گا کر سنائیں، سازوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔“

یہ کہہ کر انھوں نے پردے کے پیچھے سے ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی نکال کر سامنے اسٹیج پر رکھ دی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک طبلہ نواز بھی آکر بیٹھ گیا۔ مشاعرے میں ہٹ بونگ مچ گئی۔

ان صاحب نے دوبارہ اعلان کیا کہ ”سب سے پہلے میں آپ کو اپنا کلام گا کر سُنانا ہوا۔“ چنانچہ انھوں نے باجہ سنبھالا اور پورے تال سر سے اپنی غزل سُنائی۔ جب انھوں نے گانا ختم کیا تو وہ تالیاں پٹیں اور وہ غوغا بلند ہوا کہ الامان الحفیظ۔ اور حفیظ حفیظ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مگر حفیظ صاحب چپکے سے اٹھ کر پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ پھلے آدمیوں کا ایسے مشاعروں میں کیا کام؟

حفیظ صاحب کی شہرت میں ان کی نظم ”رقاصہ“ کو بھی بہت دخل ہے۔ ایک ریاست کے نواب نے ایک مشہور طوائف کے پیچھے ریاست کو برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک پنجابی گانا بھی بچے بچے کی زبان پر آ گیا تھا۔ ”تونبا و جدا نہیں تارینا“ وغیرہ۔ ایک جشن کے موقع پر حفیظ صاحب بھی اسی نواب کے دربار میں مدعو کیے گئے۔ حفیظ صاحب کی حق گوئی اور بے باکی نے ان سے نظم ”رقاصہ“ کہلوائی اور پھرے دربار میں انھوں نے وہ نظم سُنائی۔ حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ وہ رنڈی بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ حفیظ صاحب اسی سے مخاطب ہو کر سُناتے رہے۔ نظم میں چوں کہ اسی کو مخاطب بھی

کیا تھا اس لیے کرپلا اور نیم چڑھا! نظم بے حد تلخ ہو گئی۔

نواب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ پھر اس کے تیور بگڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد حفیظ صاحب پر انعام و اکرام کی کیسی کیسی بارشیں نہ ہوئی ہوں گی۔ یہ حفیظ صاحب کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ منہ پھٹ آدمی ہیں، صاف کہنا اور سُکھی رہنا۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ راجہ رُوٹھے گا تو اپنی نگرہی لے گا۔ اور بے تکلف دوستوں کو ایسی کھری کھری سُناتے ہیں کہ دھری جائیں نہ اُٹھائی جائیں۔ حال ہی میں سچاس ساٹھ اہل ادب کے ڈیز میں ایک بہت بڑے سرکاری انسر نے حفیظ صاحب پر چند فقرے چبُت کیے۔ پھر جو حفیظ صاحب پہنچے جھاڑ کر اس "شریف آدمی" کے پیچھے پڑے تو اُس کے نکتے لے ڈالے۔ وہ بار بار کھسیانی ہنسی منہس کر اُٹاتا رہا۔ مگر حفیظ صاحب نے لکھ پتی کی دو کوڑھی کی کر دی۔

اتفاق سے میں اُن صاحب کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔
"دیکھا آپ نے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں دیکھا۔ آپ نے اس بھڑوں کے چہتے کو کیوں چھیڑا؟"

روٹکھی مُسکراہٹ سے بولے۔ "بڑا پیارا آدمی ہے۔"

انگریزوں کا اصول تھا کہ مشہور آدمیوں کو خطاب دے کر اپنا آدمی بنا لیتے تھے۔

چنانچہ ہندوستان کے جتنے سربراہ اور وہ حضرات تھے۔ سب کو انگریز نے خطابات سے

نواز دیا تھا۔ اس پالیسی کے تحت انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو "سر" کا خطاب دیا تھا اور

مصوّر چغتائی کو "خان بہادر" کا۔ مگر حفیظ صاحب کو صرف "خان صاحب" حفیظ صاحب

اس کم نظری پر افسردہ اور برہم تھے۔ اور برہمی یوں اور بھی بڑھی کہ "خان صاحب" عموماً

کلاوتوں اور ڈوم ڈھاریوں کو کہتے ہیں۔ ترم سے پڑھنے کی وجہ سے "خان صاحب" کا خطاب

ان پر چپک کر رہ گیا۔ اور ان کے مخالفین اور بے تکلف دوست اُنہیں یہ کہہ کر چھیڑنے

لگے کہ "حکومت نے تمہاری صحیح قدر دانی کی ہے۔"

یہ خطاب حفیظ صاحب کے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوند رہن گیا کہ نکلے تو اندھا،

اور اگلے تو کوڑھی۔ بارے آگے چل کر حیب انہیں "خان بہادر" کا خطاب ملا تو ان کی کسی قدر اشک ستوئی ہوئی۔ مگر اب ان کی شہرت اور خدمات کی وہ نوبت آچکی تھی کہ انہیں "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا۔ سر محمد اقبال کے اٹھ جانے کے بعد حفیظ صاحب ہی کو "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا مگر ان کو "خان بہادری" ہی پر ترخا دیا اور ادھر مولانا تاجپور کو شمس العلماء بنا دیا! ط :

رُموزِ مملکتِ نویشِ خسرواں دانند

حفیظ صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، ہر رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ہر قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، ادیب ہیں، مصنف ہیں، نغمہ نگار ہیں، پرچارک ہیں، ملازم سرکار ہیں۔ بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا نہیں ہیں۔ بڑی پہلو دار شخصیت ہے حفیظ صاحب کی۔ جب کچھلی بڑی لڑائی نے زور پکڑا تو حکومت نے ساتگ پیاسی کا محکمہ کھولا۔ اس محکمہ کا کام یہ تھا کہ گانوں اور ڈراموں وغیرہ کے ذریعے بھرتی ہونے کی ترغیب دلائی جائے، اور حکومت کابل بالاکیا جائے۔ اس محکمے کے افسر اعلیٰ حفیظ صاحب مقرر ہوئے۔ حفیظ صاحب نے اس محکمے کے فرائض افسرانِ بالا کے اطمینان کے مطابق انجام دیے۔ حفیظ صاحب گیت لکھتے تھے اور سازندوں میں بیٹھ کر خود ہی گیتوں کی دھنیں سجویز کرتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ "بھئی! تم لوگ راگ راگنیوں اور تالوں کو دیکھتے ہو، ہمارا کام دوسری قسم کا ہے۔ میرا معیار گانے کا جاننے ہو کیا ہے؟ وہ جو کشمیری دروانے کے بس اسٹینڈ پر ایک اندھا فقیر کھڑا صدا لگاتا رہتا ہے نا؟ بس مجھے تو ایسی دھنیں چاہئیں" اور میں منہ پھیر کر اپنے سامتی سے کہتا۔ "ہاں، اندھوں کے لیے تو اندھوں ہی کی دھنیں چاہئیں۔"

حفیظ صاحب چونک کر کہتے۔ "کیا کہہ رہے ہو پیارے"

میں کہتا۔ "کچھ نہیں، ان سے بات کر رہا تھا۔"

پھر فرماتے۔ "اب یہ وہ حفیظ نہیں ہے جسے تم رسالوں اور کتابوں میں دیکھتے آئے

ہو۔ میں اب ایسے گیت لکھتا ہوں : میں تو چھوڑے کو بھرتی کرائی آئی رہے۔
 ”بہت اچھا حفیظ صاحب اس ہم اندر عاشقی شاید آپ ہی کے محکمے کا

ایک گیت مجھے کسی نے سُنایا تھا۔ اچھا ہے ہر بابہ کی بولی میں :

بھرتی ہو جا رہے ترے باہر کھڑے رنگروٹ

یہاں تو پہننے پھٹا پُرانا

وہاں ملے گا سوٹ

بھرتی ہو جا رہے

یہاں تو پہننے نری کا بُوتا

وہاں ملے گا لوٹ

بھرتی ہو جا رہے

یہاں تو کیوے لائٹی ڈنڈا

وہاں ملے بندوک

بھرتی ہو جا رہے

بولے۔ ”نہیں نہیں، یہ گیت میرا نہیں ہے۔ کسی اور کا ہے۔“

حفیظ صاحب اس محکمے کے اس وقت تک ڈائریکٹر رہے جب تک یہ محکمہ قائم رہا۔

حفیظ صاحب بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور آخر تک نیا ہے چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں

ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت نے پانچ سو روپے پنشن مقرر کر دی تھی، مگر کہیں اوسوں

سے پیاس بھٹی ہے؟ یہ رقم اونٹ کی ڈارھ میں زیر اہو گئی۔ مگر سوتا ایک بار پھر اس وقت معیار

پر کسا گیا، جب پاکستان میں دیہی امداد کا محکمہ قائم ہوا۔ حفیظ صاحب کو اس کا ڈائریکٹر

مقرر کیا گیا معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ مگر سیکرٹریوں کو تو چار چار ہزار ملیں اور حفیظ صاحب کو

صرف دو ہزار کی یافت ہو : ع

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

تو صاحب، چند سال کی الٹاپٹی میں یہ محکمہ بھی ختم ہو گیا۔ مگر شکر خورے کو شکر اور مؤذی کو

شکر۔ مارشل لا کا زمانہ آ گیا اور حفیظ صاحب محکمہ تعمیر نو میں مشیر مقرر ہو گئے۔ اب سُننا ہے کہ

وہ محکمہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ عارضی محکموں کی یہی تو خرابی ہے کہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ع

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو ستر کھلتے ہیں اور سبحان اللہ، حفیظ صاحب تو بڑے نصیبہ ور آدمی ہیں۔ جیسے سانپ کو زمین جگہ دیتی ہے ویسے حفیظ صاحب کو حکومت جگہ دیتی ہے۔ یہ تو درزی کی سوئی ہے کہ ریشم اور مخمل میں بھی چلتی ہے اور گارڈھے گز می میں بھی۔

حفیظ صاحب میں، شعر و موسیقی میں جو ربط ہے، اس کا سبب شاعروں سے بڑھ کر شعور ہے۔ اس کی ایک بین مثال ”ترانہ پاکستان“ ہے۔ میں اس وقت ریڈیو پاکستان میں نگران موسیقی تھا، جب ترانہ پاکستان کا غلغلہ اٹھا۔ اس ترانے کی دُھن کے پانچ ہزار اور اس کے الفاظ کے پانچ ہزار مقرر کیے گئے تھے۔ صبح سے شام تک دُھن بنانے والے اپنے سروں کو دُھنتے اور اپنی اپنی دُھنیں ریکارڈ کر کر چلے جاتے۔ کراچی کے علاوہ اور شہروں سے بھی دُھنوں کے ریکارڈ اس مقابلے میں شریک کیے گئے تھے۔ اور میعاد پوری ہو جانے پر اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم کو منتخب دُھنیں سنانی گئی تھیں چھا گلا۔ مرحوم کی دُھن سب سے بہتر سمجھی گئی تھی مگر اسے بھی لیاقت علی خاں مرحوم نے پوری طرح پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے بعد جو وزیر اعظم صاحب تشریف لائے تھے، انہوں نے مزید انتظار کیے بغیر چھا گلا کی دُھن منظور کر لی۔

اس کے بعد شاعروں کو اذنِ عام دیا گیا کہ دُھن پر ترانہ پاکستان کے بول بٹھاؤ۔ اب پھر شاعروں کی تاخت ریڈیو اسٹیشن پر ہونے لگی۔ بڑے بڑوں نے زور مارا۔ ان سب کے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔ حفیظ صاحب نے بھی اپنا ترانہ ریکارڈ کر لیا۔ پھر ان سب بولوں کی جانچ خدا جانے کن بڑے بڑے ماہروں نے کی اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ حفیظ صاحب کا ترانہ سب سے بہتر ہے۔ میں نے بھی ریکارڈنگ کے دوران میں بعض نامی شاعروں کے بول دیکھے اور سُننے تھے۔ واقع میں حفیظ کے ترانے سے بہتر تو کچا، کوئی اس کا پانسنگ بھی نہیں تھا۔

یار لوگوں نے پہلے ہی سے شور مچا رکھا تھا کہ یہ کیسی اُلٹی کارروائی ہو رہی ہے۔ پہلے چیز لکھی جاتی ہے، اس کے بعد اس کی دُھن بنائی جاتی ہے۔ یہاں پہلے دُھن بنا دی گئی ہے

اور بعد میں اُس پر پول کہلوائے جا رہے ہیں۔ بہتوں کو انگریزی میں غصہ آیا اور انہوں نے انگریزی محاورہ PUTTING THE CART BEFORE THE HORSE دہرایا۔ مگر جسے پیا چاہے وہ سہاگن۔ حفیظ صاحب سہاگن بنے اور پانچ ہزار روٹمائی میں انہیں ملے۔ مگر روپیہ پیسہ کیا ہے؟ یہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ پھر حفیظ جیسے صاحب ثروت کے نزدیک پانچ ہزار کی مہلا کیا حقیقت ہے۔ یہ کتنے بڑے اعزاز اور سرفرازی کی بات ہے کہ کسی شاعر کا لکھا ہوا ترانہ پوری قوم اور ملک کا ترانہ بن جائے۔ یہ افتخار حفیظ صاحب کو حاصل ہوا، اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔

اس کامیابی کا اعلان ہونا تھا کہ یار لوگ کوٹلوں پہ لوٹ گئے۔ اور تو اور، حفیظ صاحب کے قریب ترین دوست، قدردان، مداح، سالک اور محبید لاہوری جیسے بھی سنتے سے اکھڑ گئے۔ اور نہ صرف اس ترانے کی مخالفت ان دوستوں نے کی، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا۔ اور اس کی پیروٹی بھی لکھی۔ بلکہ ان کے ایک دوست نے جس سے چانٹا چٹول کا مذاق ہوتا ہے، اسی بجر اور اسی دُھن میں ایک فحش پیروٹی لکھی، جسے وہ مزے لے لے کر حفیظ صاحب کی موجودگی میں دوستوں کو سنایا کرتے تھے اور حفیظ صاحب کھستے رہ جاتے تھے۔ دوستوں کا یہ وقر ذرا کم دیکھنے میں آتا ہے۔

حفیظ صاحب کو میں نے بیسیوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں پڑھتے سنا ہے۔ بڑے اعتماد سے پڑھتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہے۔ چالیس چالیس سال پہلے کی کہی ہوئی طویل طویل چیزیں انہیں اب بھی ازبہ ہیں۔ جب وہ کسی شاعرے میں اپنا نیا کلام سُنتے ہیں تو اُن سے ”رقاصہ“ یا ”بسالے اپنے من میں پریت“ یا ”جاگ سوزِ عشق جاگ“ سُنانے کی ضرور فرمائش کی جاتی ہے۔ اب وہ سُنانے سے پہلے ایک چھوٹی سی تقریر بھی ضرور کرتے ہیں۔ اور جب زیادہ لاڈ میں آتے ہیں تو غنغنا کر بولنے لگتے ہیں اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ادا ہے۔ اور جب انہیں کسی شعر کی بہت داد ملتی ہے تو وہ اس قدر بک بک کر اس شعر کو دہراتے اور مہراتے ہیں کہ مشاعرے کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ان کا غمزہ تمکنا ہے۔ ان کے قدردان

ان کی انہی اداؤں پر لوٹ ہیں۔

حفیظ صاحب شہرت کے اس درجے پر اب پہنچ گئے ہیں کہ جب ان سے پہلی بار کسی کا تعارف کرایا جاتا ہے تو صرف بسور کر کھیسیں نکال دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ نئے آدمیوں سے بات کرتے ہیں اس قدر احتیاط برتتے ہیں کہ خاموش رہنے ہی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سے کئی کئی دفعہ تعارف ہو چکا ہے مگر پھر جب ملتے ہیں تو انجان بن جاتے ہیں۔ شاید تجاہل عارفانہ بھی بڑے آدمیوں کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ شاید نہ پہچاننے سے بزرگی و عظمت قائم ہوتی ہو؟ یہ حادثہ بار بار مجھے پیش آچکا ہے کہ میں نے مؤذبانہ سلام کیا اور انہوں نے نہایت بے مروتی سے سر کو خفیف سی جنبش دے دی، یا ہاتھ سے مکھی سی اڑادی۔ جب پھر کچھ دیر بعد کسی نے تعارف کرایا تو پہلے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، پھر چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کیا، پھر فوراً مسرت کا۔ اور پھر "اے تم ہو شاہد!" کہہ کر گلے لگالیا۔ اگلی دفعہ پھر اجنبی کے اجنبی دھرے ہوئے ہیں۔

اصل میں اس بناوٹ کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ انہیں ہزاروں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے، کہاں تک اور کس کس کو یاد رکھیں؟ لہذا اب میں انہیں یاد رکھتا ہوں اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی ان سے آنا سا منا ہو جاتا ہے تو میں خود ہی "ہاؤ" کر کے ان سے لپٹ جاتا ہوں۔ میں ان سے کئی سال چھوٹا ہوں، مگر وہ میری اس گستاخی کو گوارا فرما لیتے ہیں۔

حفیظ صاحب کو ان کے اسی تجاہل عارفانہ اور خاموشی کی وجہ سے لوگ مغرور اور اوجھا آدمی سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل کھرے سونے کا ہے۔ مگر اس دل کی گھنڈی وہ بڑی دیو میں کھولتے ہیں۔ اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو پھر ان کے بے پایاں خلوص کو دیکھیے، ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔

۱۹۵۰ میں بے کاری و بے روزگاری کی وجہ سے جب میرا سارا اندوختہ ختم ہو گیا، اور میں مفروض ہونا شروع ہو گیا تو چند مہلے آدمیوں نے مجھ سے کہا کہ میاں یوں کب تک گزر کر دو گے؟ ہم نے تمہارے لیے بات کی ہے۔ شیخ محمد اکرم صاحب تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ تم سے واقف ہیں۔ تم ذرا ان سے مل لو۔ چنانچہ شیخ صاحب سے ملنے دو ایک دن کے

بعد ان کے دفتر پہنچا۔ اطلاع کرائی، رسائی ہوئی، خوش اسباقی سے ملے۔ کم گو آدمی ہیں مگر معاملہ فہم اور مردم شناس۔ بولے: "آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے، مگر ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ یا تو "ماہ نو" کی اڈیٹری قبول فرمائیے یا ریڈیو پاکستان میں آجائیے۔"

میں نے کہا: "میں اپنا پرچہ ساقی" نکالتا ہوں اس لیے "ماہ نو" کا اڈیٹر نہیں بن سکتا۔"

بولے: "تو ریڈیو پاکستان میں آجائیے اور ہمارے سیکرٹری جی، احمد صاحب سے بھی ملنے جائیے۔"

میں نے کہا: "کیا آپ سے مل لینا کافی نہیں ہے؟"

بولے: "رسمًا مل لیجیے۔"

جی، احمد صاحب سے بھی ملا۔ انہوں نے فرمایا: "اکرم صاحب نے ابھی ابھی بتایا کہ آپ ریڈیو پاکستان میں آ رہے ہیں۔ بہت خوشی کی بات ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔"

فرمایا: "اسے آپ نوکر ہی ہرگز نہ سمجھیں۔"

ان کے کمرے سے باہر نکلا تو سامنے برآمدے میں اے۔ ڈی۔ اظہر اور حفیظ صاحب کھڑے نظر آئے۔ دونوں سے مصافحہ ہوا۔

حفیظ صاحب نے پوچھا: "خیر تو ہے، آپ یہاں کہاں؟"

میں نے کہا: "نوکر ہی لینے آیا تھا۔"

پھر مختصر رُوداد انہیں بتائی تو بے حد اُداس اور متاسف ہو کر اظہر صاحب سے بولے:

"سُنتے ہو اظہر، پاکستان میں شاید نوکر ہی کر رہا ہے!"

پھر اظہر صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ اس وقت پاکستان ریلوے کے فنانسٹل ایڈوائزر تھے۔ دیر تک افسوس کرتے رہے اور مجھے سمجھاتے رہے۔ حفیظ صاحب کو اس دن میں نے دیکھا کہ واقعی انہیں اس اطلاع سے صدمہ ہوا۔ یہ اگر ان کا خلوص نہیں تھا تو پھر کیا تھا۔

حفیظ صاحب نے ویسے تو دنیا بہت دیکھی اور زمانے کا گرم و سرد بھی چکھا ہے مگر

ان میں چھل فریب اور مسکاری نہیں ہے۔ کبھی کبھی بڑی بھولی بھولی باتیں کرتے ہیں تو ان پر بڑا پیار آتا ہے۔

ایک دفعہ کہنے لگے۔ "میں سرکاری ملازمتوں اور اس کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بس پچھریں یہ کروں گا کہ مسجدوں اور دیہاتوں میں جایا کروں گا اور مجمع سے کہوں گا۔" لاؤ، تم سب دو دو پیسے نکالو، میں تمہیں "شاہنامہ اسلام" سناؤں گا۔ میرے پاس اتنے پیسے آہی جائیں گے کہ دو وقت کی روٹی مجھے مل جائے گی۔ باقی وقت میں کتابیں لکھوں گا۔ قوم کا بھی مہلا ہوگا اور اپنا بھی۔"

حفیظ صاحب کے بھولپن کا ایک اور واقعہ یاد آیا:

دو ڈھائی سال ہوئے کہ ایک خیر سنگالی وفد وئی گیا تھا۔ اس میں حفیظ صاحب بھی تھے۔ امرت سرپر حکومت ہند کا ایک نمائندہ ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھا۔ اسٹیشن کے رستوران میں سب کو کھانا کھلایا گیا۔ اتنے میں ریل کے آنے کا وقت ہو گیا۔ سب کی سیٹیں فرسٹ کلاس میں بک تھیں۔ ہر ڈبے میں چار سیٹیں تھیں۔ ہم چار چار کی ٹولیوں میں بیٹ گئے۔ دو الفقار بخاری، شوکت متھانوی، سید محمد جعفری اور میں ایک ڈبے میں داخل ہو گئے۔ قلی نے بستر کھول کر لگا دیے۔

جب ہم اپنی اپنی سیٹوں کے ہو گئے تو بخاری صاحب نے کہا۔ "ارے یار۔ حفیظ کولاؤ۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔"

شوکت متھانوی ان کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ جب گاڑی چھوٹنے لگی تو وہ ڈگ بھرتے ہوئے آئے اور بولے۔ "حفیظ تو ایرکنڈیشنڈ کوچ میں سو رہے ہیں۔ میں نے سارے فرسٹ کلاس دو دفعہ چھان ڈالے۔ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ پھر کنڈکٹر گاڑی سے میں نے کہا کہ صاحب، ایک صاحب، جن کا نام ابوالاثر حفیظ جالندھری ہے، ہمارے ساتھ وفد میں آئے تھے، وہ کھو گئے ہیں، کیا آپ ان کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟"

اُس نے لسٹ نکال کر دیکھی اور بولا۔ "وہ دیکھیے ایرکنڈیشنڈ کوچ ہے۔ اس کے قلاب خانے میں آپ کے دوست ہیں۔"

میں نے وہاں جا کر دیکھا تو حفیظ صاحب آرام سے پڑے سو رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”حضرت ابھی سے سونے کا کیا موقع ہے؟“

تو بولے۔ ”یار لڑ لڑ کر تو یہ جگہ لی ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ یہ مجھ سے چھین جائے؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے اس میں جگہ نہ دی گئی تو میں واپس چلا جاؤں گا، اور تم، تم تو.... ہو۔ جسے تم فرسٹ کلاس سمجھ رہے ہو وہ دراصل سیکنڈ کلاس ہے۔ جاڈ بیٹا اسی میں مرو۔ بندہ تو اب سوتا ہے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے کروٹ لے لی۔

بخاری صاحب نے اس اطلاع پر ہنس کر کہا۔ ”میاں تم تو کہتے تھے کہ حفیظ بھولا

آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھولا آدمی ہی ایسی بات کر سکتا ہے۔“

جب وفد کا کام ختم ہو گیا تو سب سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہہ دیا کہ کل صبح ہم سب کو ہوٹل چھوڑ دینا ہے۔ جو صاحب دلی میں ابھی اور مٹھرنا چاہیں، اپنا انتظام خود کریں۔ میں تو اسی شام ہوٹل سے اٹھ کر شہر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں آ گیا۔ پانچ چھ دن اور دلی میں مٹھرا۔ واپسی ٹکٹ سب کے پاس تھے۔ جس رات کو واپسی تھی میں اسٹیشن پہنچا تو فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس پر بہت بھیر تھی۔ ان میں جگن ناتھ آزاد اور کئی شاعر۔ کھڑے دکھائی دیے۔ ان سے تجدید ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب کے سب لائل پور جا رہے ہیں ایک مشاعرے میں۔ میں ان حضرات سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک سردار جی گھبرائے ہوئے آئے اور بولے۔ ”آپ حفیظ جالندھری ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں، میرا نام تو شاہد احمد دہلوی ہے۔“

آزاد صاحب نے انھیں بتایا کہ حفیظ صاحب تو صبح کی گاڑی سے لائل پور چلے گئے۔“

میں نے کہا۔ ”فرمائیے آپ کو حفیظ صاحب سے کیا کام ہے؟“

سردار جی بولے۔ ”جی میں یہاں کا بکنگ کلرک ہوں۔ حفیظ صاحب نے اپنا دلی سے لاہور کا واپسی ٹکٹ واپس کر دیا تھا اور میں نے اس کا پے منٹ کر دیا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کچھ اس قسم کا سرکاری ٹکٹ تھا جو واپس نہیں کیا جاسکتا۔ اور جی میں تو غریب

آدمی ہوں، مجھے اپنی جیب سے یہ پیسہ مہرنا پڑے گا۔
میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ ”آپ گھبرائیے نہیں، آپ کا پیسہ آپ کو واپس مل جائے گا۔“

سب شاعر کھڑے یہ باتیں سن رہے تھے۔ میں نے آزاد صاحب سے کہا کہ ”آپ لائل پور پہنچ کر حفیظ صاحب سے ٹکٹ کے پیسے واپس لے لیں اور ان سردار جی کو واپسی پر دے دیں۔“ بچارا سردار شکریہ ادا کر کے ریل کے چھوٹنے تک وہیں کھڑا رہا۔
ہوا یہ تھا کہ حفیظ صاحب کے پاس دو ٹکٹ پاکستان جانے کے ہو گئے تھے۔ ایک وفد کی واپسی تھی اور دوسرا مشاعرے کا ٹکٹ۔ لہذا انھوں نے واپسی ٹکٹ واپس کر دیا۔ اور کسی نے واپس کرنے پر رد و کد بھی نہیں کی۔ لہذا انھوں نے پیسے جیب میں ڈالے اور پاکستان چل دیے۔ مگر بار لوگ بعد میں کہتے رہے کہ حفیظ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے ہمیں ہندوستانیوں کی نظر میں ذلیل کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ”حفیظ صاحب آنرڈ ٹکٹوں کا کیا کرتے؟“ وہ کہتے ہیں کہ ”دوسرا ٹکٹ لیا ہی کیوں؟“ یہ عجیب منطوق ہے۔
پیسہ آتا ہوا کس کو بُرا لگتا ہے؟

حفیظ صاحب اردو کے شیدائی اور شعر و ادب کے فدائی ہیں۔ یوپی والوں نے ایک زمانے میں ان کے کلام پر بھی بڑی لے دے کی تھی۔ اہل زبان کو اگرچہ اس کا حق حاصل ہے کہ غیر اہل زبان کی غلطیوں سے انھیں آگاہ کریں، مگر اس کا بھی ایک تئاسرہ پیرا یہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ والوں نے ایک باقاعدہ محاذ بنا رکھا تھا اور اسے بڑی فوقیت سمجھتے تھے کہ دوسرے شہر والوں کی زبان پکڑتے رہیں۔ یہ ان کی پُرانی خصلت ہے۔ اسی وجہ سے دلی اور لکھنؤ کے دو دبستان بنے اور ان میں بڑے بڑے معرکے ہوتے رہے۔ حفیظ تو حفیظ انھوں نے اقبال تک کو نہیں بخشا۔ مرحوم نے ایک آدھ بار تو جواب دیا اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ مگر حفیظ صاحب لڑنے اور اڑنے سے نہیں گھبرائے۔ یہاں تک کہ ادب کے لٹھ بندوں نے ان کا لوہا مان لیا۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے :

حفیظ اہل زبان کب مانتے تھے بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

لکھنؤ والوں کے مُنہ کو تو تون لگ گیا تھا۔ جب کوئی اور ہاتھ نہ آتا تو آپس میں ہی لڑتے مرنے تھے۔ آخری معرکہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اثر اور فراق کا ہو چکا ہے۔ جس میں نوبت کھلی کھلی گالیوں تک پہنچی۔ اب آخر آخر میں ان کا کچھ دف مرا ہے۔ جب بھارت کی حکومت نے خود ان کے صوبے میں اردو کو کوئی حیثیت نہیں دی اور ان کا بیس لاکھ دستخطوں کا محضر بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔

حفیظ صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہیں کہ ان کی خانگی زندگی ہمیشہ خوش گوار گزری۔ بعض سطحی نظر رکھنے والے حضرات معترض ہوتے ہیں کہ انہوں نے ایک چھوڑے تین تین شادیاں کیوں کیں؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ حسبِ ضرورت کیں۔

جب وہ سر عبدالقادر کے ساتھ ولایت گئے تو وہاں سے ایک میم کر لائے۔ وہاں تو عورت ایک چھو لگنی بیماری ہے۔ حفیظ صاحب شریف آدمی ہیں۔ وہاں کوئی گلے پڑ گئی تو اسے اپنے ساتھ لانا ہی پڑا۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یار لوگ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر بیویاں یا داشتائیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ قصہ زمیں بر سر زمیں۔ مگر شریف آدمی کی بڑی مشکل ہے کہ اپنی شرافت میں مارا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب اپنی میم صاحب کو ساتھ لے آئے۔ کئی سال تک وہ ان کے ساتھ رہے۔ ان سے بچے بھی ہوئے۔ مگر اس قوم میں وقاداری کہاں؟ بڑی بے مروتی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنے بچوں کو لے کر میم صاحب اپنے وطن ہمیشہ کے لیے سدھار گئیں۔ کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرنے میں شرافت مانع تھی اور حفیظ صاحب اپنا دل مسوس کر رہ گئے۔

اللہ نے انہیں اس صبر کا اجر یوں دیا کہ انہیں دہلی کے ایک شریف گھرانے کی خالو اس سانحہ کی تلافی کرنے کے لیے مل گئیں اور حفیظ صاحب نے چپ چپاتے ان سے شادی کرنی۔ ان کے اکثر احباب کو بھی اس کا علم نہیں ہوا۔ ضرورت بھی کیا تھی اس کی نشہیر کرنے کی؟ مجھ پر بھی یہ بات یوں کھل گئی کہ چند سال پہلے میں جب ریڈیو پاکستان لاہور، پروگرام نشر کرنے گیا تو ڈیوٹی روم میں ایک جانی پہچانی خاتون کو بھی بیٹھے دیکھا۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان کر سلام کیا۔

ڈیوٹی آفیسر نے حیران ہو کر باری باری سے ہم دونوں کو دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔
 ”آپ امیں کیسے جانتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”یہ آل انڈیا ریڈیو، وٹی کے ڈراموں میں شریک ہوا کرتی تھیں اور
 قیام پاکستان کے بعد ہمارے اسٹیشن کے ڈراموں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔“
 ”جی ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھی کراچی میں بھی ہم لاہور کے ڈرامے
 سن لیتے ہیں۔“

”بس آپ کو اتنا ہی معلوم ہے؟“

”اس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی مجھے کیا ہے؟“

”اجی صاحب، یہ مسٹر حفیظ ہیں۔“

”اِس؟ اچھا تو آپ ہیں مسٹر حفیظ! مسٹر حفیظ السلام علیکم!“

پھر ہم سب ہنس پڑے، اور چائے آگئی۔ اور مسٹر حفیظ نے چائے بنا کر سب
 کو پیش کی۔ حفیظ صاحب واقعی خوش نصیب ہیں کہ امیں اتنی اچھی بیوی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ
 جو کام کرتا ہے، بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ اگر ہم صاحب روٹھ کر نہ چلی جاتیں تو یہ تیک
 بی بی حفیظ صاحب کو کہاں سے ملتی؟

”خدا شرتے بر انیکتر د کہ خیر ادر اں یا شد“

حفیظ صاحب علم و ادب یا ادیبوں کا کوئی کام ہو، اس میں بے چوں و پیرا شریک
 ہو جاتے ہیں۔ عجیب لوح دار طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ بڈھوں میں بڈھے، جوانوں
 میں جوان اور بچوں میں بچہ بن جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو نے بھی امیں
 ہر دل عزیز بنا رکھا ہے۔

جب ہم نے گلڈ کا پہلا جلسہ کیا تو کئی سو بلاوے پاکستان کے دونوں حصوں میں
 ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے تھے۔ مجھے کنوینر بنایا گیا تھا۔ خدا کے فضل سے سبھی اس جلسے
 میں شریک ہو گئے تھے۔ اور جب اس کے ضوابط مرتب کیے گئے تو ان پر خاصہ ہنگامہ ہوا
 تھا۔ حفیظ صاحب ایک ایک کو ٹھنڈا کرتے پھرتے تھے۔ کسی کو پیار سے راضی کرتے اور

کسی کو خوشامد درآمد سے اور کسی کو آنکھیں دکھا کر۔ اس سے زیادہ ہنگامہ اُس وقت ہوا، جب الیکشن ہوا۔ طے یہ ہوا کہ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ اور مرکزی گلڈ کا الیکشن فی الحال کر لیا جائے۔ لاہور اور ڈھاکہ کے الیکشن میں کچھ سچپدگیاں پڑیں مگر کراچی والوں نے یہ عجیب فیصلہ کیا کہ مجھے نامزد کر دیا کہ کراچی کے لیے ممبر میں نامزد کر دوں۔

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

یہ ہفت نواں بھی بغیر کسی اختلاف کے بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ حفیظ صاحب کا نام کسی فہرست میں شامل نہیں ہوا، مگر ان کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی۔ انہوں نے نہ تو اس وقت نہ تو کسی سے شکایت کی اور نہ بعد میں انہیں گلڈ میں کوئی عہدہ دیا گیا۔ بلکہ اب تک کے ہر معاملے میں ہم ان کے بزرگانہ مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور خود حفیظ صاحب اپنے آپ کو گلڈ کا ایک مستعد سپاہی سمجھتے ہیں۔ جب بھی ہمیں ان کی ضرورت ہوتی ہے ہم انہیں بے تکلفی سے بلا لیتے ہیں اور وہ اپنے دس کام چھوڑ کر آجاتے ہیں۔ یہ کتنے بڑے طرف کی بات ہے کہ بغیر کسی ذاتی مفاد کے حفیظ صاحب گلڈ کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک بہت بڑے شاعر اس بات پر مچلے ہوئے ہیں کہ مجھے گلڈ میں کوئی عہدہ دیا جاتا تو میں ممبر بن جاتا۔ اس کے برعکس حفیظ جیسی عظیم شخصیت کا شاعر ہانکے پکارے کہتا رہتا ہے کہ مجھے گلڈ میں ہرگز کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ میں گلڈ کا ایک خادم ہوں اور خادم ہی رہنا چاہتا ہوں۔

بہیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

دو ڈھائی مہینے ہوئے کراچی کے گلڈ نے "یوم نذیر احمد" منایا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے گلڈ کے تمام ممبروں اور غیر ممبروں کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا گیا تھا۔ حفیظ صاحب اتفاق سے کراچی میں موجود تھے۔ ان کی بھلمنسا بہت دیکھیے کہ وہ نہ صرف اس تقریب میں شریک ہوئے بلکہ انہوں نے نذیر احمد کے ادب اور معاشرے پر اس کے اثرات پر ایک جامع تقریر کی تھی اور اس موقع کے لیے نذیر احمد پر ایک یادگار نظم بھی لکھی۔ وہ نظم آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اے نذیر احمد صریح ہر قسم ہے تیری یاد لوحِ دل پر جب سے تو نے لکھ دیا حق العباد
تیری تحریروں سے پہلے کیا تھی حالت قوم کی چھائی متھی بن کر مرض ہر سو جہالت قوم کی

نہض تو نے دیکھ لی بگڑا ہوا تھا ہر مزاج
 اے مسیحائے قلم! تو نے کیا اس کا علاج
 دُور رس منفی عقل تیری اور روشن تھا دماغ
 ملک میں روشن کیا تہذیب کا تو نے چراغ
 تیری ہر تحریر ہے تصویرِ نورِ شدیدِ علوم
 کرتے ہیں کسبِ صیبا اس نور سے ماہ و نجوم
 نور تیرے ہی قلم نے ملک میں پھیلا دیا
 رات کو دن کر دیا کرنوں کا مینہ پر سا دیا

دشمنِ اسلام کا مُخف تو نے کالا کر دیا

علم و فن کا رُوئے عالم میں اُجالا کر دیا

حفیظ صاحب جب ہماری دل بونی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں تو ہم مہیلا امھیں اپنے
 دل میں جگہ کیوں نہ دیں؟ یہ حفیظ صاحب کی تیک نیتی اور نیک نفسی ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
 انھیں ہر قسم کا سکھ دے رکھا ہے۔ شہرت، عزت، دولت، سمجھی سے اللہ نے انھیں نوازا
 ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی ایک چھوڑ دو کوٹھیاں ہیں۔ چلن کے آدمی ہیں، کوئی غیب ان کے
 پیچھے نہیں لگا ہے۔ اپنے آپ کو انھوں نے بڑی محنت سے بنایا ہے۔ اس لیے انھیں روپے
 پیسے کی بھی قدر ہے۔ بٹزدس ہیں۔ بلکہ ان کی بٹزدسی کینوسی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ کینوس
 کہلاتا سرف کہلانے سے بہر حال بہتر ہے۔ انھوں نے اپنی کار کبھی نہیں خریدی، حالانکہ
 وہ اگر چاہیں تو ایک تہیں دو دو کاریں رکھ سکتے ہیں۔ ان کا کوئی شوق یا مشغلہ ایسا
 نہیں ہے جس میں پیسہ خرچ ہوتا ہو، دولت لٹانا اور گھر مھو تک تماشادیکھنا کوئی ہنر بھی تو
 نہیں ہے۔ انھوں نے ساری عمر محنت سے پیسہ کمایا ہے، اس لیے انھیں اس کی
 قدر بھی ہے۔

آخر میں حفیظ صاحب کی ایک خصوصیت اور سن لیجیے :

حفیظ صاحب کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کان ادھر لائیے، چپکے سے اس سلسلے
 میں ایک بات سنئے۔ حفیظ صاحب اس قدر محتاط ہیں کہ انھوں نے کبھی کسی کو کھانے پر
 آنے کی تکلیف بھی آج تک نہیں دی۔

ڈپٹی صاحب

ڈپٹی صاحب بڑے کٹھنٹھے کے آدمی تھے۔ قد لمبا، بدن دہرا، سر پر مشین پھرواتے تھے اور تالو پر پان کھلواتے تھے۔ اس میں بالالترام تیل ڈلواتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس سے دماغ میں تراوٹ آتی ہے۔ کشادہ پیشانی، جھٹی بھنویں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، بیٹھی ہوئی پھلکی سی ناک، پھبتی باز کہتے تھے اس پر سے گاڑھی کا پتیا مھر گیا تھا۔ آنکھیں چپاں سی مگر بڑی بے قرار۔ ہم نے جب انھیں دیکھا تو ان کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ سوچیں اننی لمبی کہ گل مچھوں کو بھی پار کر گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ جوانی کی ترنگ میں ڈپٹی صاحب ضرور ان پر نیبو رکھتے ہوں گے۔ دلی کے شرفا کے دستور کے مطابق ڈپٹی صاحب کو بھی سچپن سے ورز شس کا شوق تھا۔ دیوان خانے میں مگر، موگر یوں کی جوڑی اور بگڈ رکھے ہوئے تھے۔ دو سو ڈنٹر بیٹھکیاں نکالنا ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کے بعد جوڑی ہلاتے اور مگر پھراتے۔ محلے میں اکھاڑہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں ایرے غیرے نہ تو خیرے نہیں آسکتے تھے۔ صرف بھلے آدمیوں کے بچے آتے تھے۔ استاد ماہ رخ بیگ روزانہ صبح کو دو گھنٹے کے لیے آتے۔ پستوں کو لٹنٹ کرانے اور داؤ پیچ سکھانے۔ ڈپٹی صاحب بھی اپنے لڑکپن میں استاد کے شاگرد ہوئے تھے۔ شاگرد کا جسم سڈول بنانے کے لیے استاد طرح طرح کی ورز شس بتاتے تھے۔ انگر کھے پہننے کا عام رواج تھا۔ مگر یہ انگر کھے صرف ان پر سجتے تھے جن کے بدن کسرتی ہوتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کا گردنا تیار، چوڑا پچلا سینہ، چھلا سی کمر، پیٹ کمر سے لگا ہوا، بازوؤں کے مچھلے اٹے ہوئے، بغل بچے ابھرے ہوئے۔ ڈپٹی صاحب پر انگر کھا ایسا چست بیٹھا تھا کہ جڑو بدن ہو جاتا تھا۔

ڈپٹی صاحب کا شمار خوب صورتوں میں کبھی نہیں ہوا مگر ان کی جامہ زیبی ہزاروں میں ایک تھی جینی ہوئی دوپٹی، سفید براق تن زیب کا انگر کھا، آڑا جامہ، آدھی پنڈلیوں تک چوڑیاں پٹی

ہوئیں۔ پاؤں میں زرکار سلیم شاہی۔ بائیں ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوا۔ دائیں ہاتھ میں چاندی کے موٹھ کی چھڑی۔ دونوں ہاتھوں اور سر کے اشارے سے سلام لیتے۔ جب وہ شام کو بازار میں معامل سے چوک کا رخ کرتے تو سب کی نظریں انہی پر لگی رہتی تھیں۔

ڈپٹی صاحب محکمہ آب کاری میں انسپکٹر لے لیے گئے تھے۔ اب ترقی کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں لٹویچو انگریز بھی نہیں آتے تھے۔ تشریف گھرانوں کے انگریز افسر آتے تھے اور ہندوستانیوں کو ملازمت دینے سے پہلے ان کی شرافت اور خاندانی وجاہت کو ضرور جانچ لیتے تھے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ اس لیے خوب ٹھونک بجا کر آسامی دیتے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے اپنی محنت و کارکردگی سے انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ وظیفہ یاب ہونے سے کئی سال پہلے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے مگر آخر تک ڈپٹی صاحب ہی کہلائے۔

گھڑ سواری کا انہیں شوق تھا۔ ایک گھوڑا انہیں سرکار کی طرف سے ملا ہوا تھا جو سرکاری دوروں میں کام آتا تھا۔ اس کے علاوہ کم از کم دو گھوڑے اور ان کی سواری میں رہتے تھے۔ مُنہ زور سے مُنہ زور گھوڑے کو ڈپٹی صاحب چیں بلوا دیتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کے ایک زمیندار دوست نے میرٹھ کی نوچندی سے ایک نقرہ خریدنا تھا۔ یہ بچھیرا سواری کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے سوار کے سائے تک سے بھڑکتا تھا۔ زمیندار صاحب نے خود بیسیوں گھوڑے ٹانگ تلے سے نکال دیئے تھے مگر یہ بچھیرا ان کے قابو میں کسی طرح نہ آتا تھا۔ ڈپٹی صاحب سے اس کا ذکر آیا تو بولے۔ "ذرا ہم بھی اُسے دیکھیں" حکم کی دیر تھی۔ داروغہ اصطلح سے بچھیرے کو لے کر فوراً حاضر ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "کامٹی یازین کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف لگام رہنے دو۔" پھر قریب جا کر اس کی کمر پر ہاتھ بچھیرا۔ بچھیرے نے اچھل کود دکھائی اور دولتی جھاڑی چسٹم زدن میں ڈپٹی صاحب اس پر سوار تھے اور بچھیرا الٹ ہو رہا تھا۔ جب اپنے سوار کو پھینک نہیں سکا تو لے کر بھاگا اور ہوا سے یا تین کمرے لگا۔ کوئی ادھر گھنٹے بعد دیکھا کہ گھوڑا اور سوار دونوں پسیتے ہیں تہائے چلے آ رہے ہیں۔ بچھیرے کے نختے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ بچھیرے بندھی ہوئی تھی اور گردن لٹکی ہوئی تھی۔ ڈپٹی صاحب

نے لگام سائیس کو تھمائی اور زمیندار صاحب سے کہا۔ "یہ گھوڑا سواری کے کام کا نہیں ہے۔ آپ اسے اپنے دوپہیے یا بگھی میں لگائیے۔" زمیندار صاحب نے کہا۔ "کوئی وجہ تو معلوم ہو، آخر کیوں؟" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "یہاں آئیے۔ ذرا اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرئیے۔" انھوں نے ہاتھ پھیرا تو گھوڑا بدکا۔ ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔ "کیا دیکھا؟"

"بس یہ دیکھا کہ ہاتھ پھیرنے سے گھوڑا بدکتا ہے۔"

"کیوں بدکتا ہے؟"

"میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ آپ بتائیے۔"

"آپ کے ہاتھ نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی ہے؟"

"نہیں۔"

"یہ دیکھیے، عین بچوں بیچ کمر کا ایک مہرہ اُبھرا ہوا ہے۔"

زمیندار صاحب نے ہاتھ پھیر کر مہرے کو چٹکی میں لینا چاہا تو گھوڑا اُچھلا۔ بولے،

"ہاں صاحب ہے۔"

"بس یہ گھوڑا اسی وجہ سے سواری نہیں دیتا۔ میں نے اس پر سوار ہوتے سے پہلے اس عیب کو دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے ذرا پیچھے ہٹ کر سوار ہوا تھا۔ اس کا یہ عیب دُور نہیں ہو سکتا۔ لہذا آپ اسے جوتنے کے کام میں لیجیے۔"

ہم نے خود تو دیکھا نہیں، ہاں دیکھنے والوں سے سنا ہے کہ جوانی میں ڈپٹی صاحب گھوڑے کو سر پیٹ دوڑاتے اور جب کسی مضبوط درخت کے نیچے سے نکلتے تو اس کے گدے میں مع گھوڑے کے لشک جاتے۔

ڈپٹی صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ ان کا نشانہ اتنا سچا تھا کہ چھوٹی دوانی کو اُچھال کر رفل کی گولی سے اُڑا دیتے تھے۔ شیر کا شکار مچان پر سے کبھی نہیں کھیلا۔ کہتے تھے کہ "یہ تو لونڈیوں کا کھیل ہو گیا کہ ایک دن کڑا باندھ دیا۔ رات کو شیر آکر اسے مار گیا۔ اس گارے پر اگلی رات کو شیر ضرور آئے گا۔ لہذا مچان پر جا بیٹھے اور شیر آیا تو اسے مار لیا۔ مچلا اس میں کیا لطف آیا۔ جب تک خطرے میں اپنی جان نہ ڈالی جائے، شکار کا

مزا نہیں آتا، لہذا ڈپٹی صاحب ہمیشہ زمین پر ہی سے شیر کا شکار کھیلتے تھے۔ جنگل میں اپنے ساتھ بکری کا ایک سفید بچہ لے جاتے۔ سفید اس لیے کہ اندھیرے میں بھی کچھ نہ کچھ دکھائی دیتا رہے۔ اسے ایک درخت سے باندھ دیتے اور خود ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ جاتے۔ بکری کا بچہ اکیلا رہ جاتا تو چھینٹا شروع کرتا۔ مقوڑی دیر بعد جنگلی چوندوں اور پرندوں کی مخصوص آوازوں سے ڈپٹی صاحب کو معلوم ہوتے لگتا کہ جنگل کے بادشاہ کی سواری آرہی ہے۔ نقیب بادب، بالملاحظہ، ہوشیار کی صدائیں لگا رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ شیر اب یہاں آگیا اور اب یہاں۔ ڈپٹی صاحب کی نگاہ اب روبرو ہے۔ لو اب بکری کے بچے کی آواز بند ہوگئی اور اس کے سارے بال سیہہ کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ جھاڑی کی اوٹ میں سے شیر کا چہرہ نمودار ہوا ہی تھا کہ ایک گولی اُس کے ماتھے پر پڑی، شیر کئی گز اوپر کو اچھلا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے ریسٹ ہاؤس میں آکر آدمیوں کو بھیج دیا کہ جا کر شیر کو اٹھا لائیں اور بکری کے بچے کو بھی کھول لائیں۔

ایک دفعہ کلکٹر صاحب کے ایک دوست شیر کا شکار کھیلنے آئے۔ اُن کے لیے ہاتھیوں اور بانکے کا انتظام کیا گیا۔ یہ ہاتھی شیر کے شکار کے لیے ساہائے لگے تھے۔ ایک پر کلکٹر صاحب اور ان کے شکاری دوست سوار ہوئے۔ دوسرے پر ڈپٹی صاحب اور تیسرے پر پیشہ ور شکاری تھے۔ جنگل کے ایک کھلے حصے میں ایک ٹیکری پر تینوں ہاتھی تھوٹے مقوڑے فاصلے سے کھڑے تھے۔ ہانکا شروع ہوا۔ ڈھول اور کنستریٹ پیٹے جا رہے تھے اور شور مچایا جا رہا تھا۔ جنگل کے جانور گھبرا گھبرا کر بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہاتھیوں اور آدمیوں کو دیکھ کر ادھر ادھر مچھلانگیں بھرتے نکلے جا رہے تھے۔ جنگل کا بادشاہ اپنی میٹھی نیند سے اس بدتمیزی سے جگائے جانے پر بھینچلا کر اٹھا اور شور و شغب کی دوسری سمت میں روانہ ہو گیا۔ جب کھلی جگہ میں پہنچا تو اپنے راستے میں ہاتھیوں کو حائل پایا۔ زمین کی طرف مٹھ کر کے زور سے دھاڑا۔ سارا جنگل لرز گیا۔ انگریز مہمان نے سرکس کے نیم جان شیر دیکھے تھے۔ اب جو جنگل کے شیر کو دیکھا اور اُس کی ڈانٹ سنی تو ہاتھ سے رفل چھوٹ کر گر پڑی اور خود "ٹائیگر ٹائیگر" کہتے بے ہوش ہو گئے۔ کلکٹر صاحب نے گولی ماری تو اچھی پڑی۔ بجلی کی طرح تڑپ کر شیر کلکٹر صاحب

کے ہاتھی کے پٹھے سے اچھٹا۔ ہاتھی نے چیخ مار کر اپنی سونڈ ہوا میں اچھالی، مگر شیر تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ڈپٹی صاحب اس وقت فائر نہ کریں تو شیر نے کلکٹر صاحب اور ان کے مہمان کا کام تمام کر دیا تھا۔ شیر گر گیا مگر اس پتے میں اس نے ہاتھی کے کولھے پر سے من ڈیڑھ من گوشت اتار لیا تھا۔ ہاتھی نے زخمی شیر کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر دے مارا اور اپنے پیروں سے اسے زرد کر بے ہنگم سا ڈھیر بنا دیا۔

ڈپٹی صاحب کے شکار کے کسی قصے مشہور ہیں۔ آدم خورشیر، خونریز بچھڑ، مسست ہاتھی اور مگر چھڑ، سبھی ان کی گولی کا شکار ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ چار ڈاکو ان کے گھر میں گھس آئے۔ کھڑکا سن کر ان کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ دو آدمی کو مٹھری میں گھس رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے لپک کر کو مٹھری کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ اتنے میں پٹ کر جو دیکھتے ہیں تو دو ڈاکو ڈھانٹے باندھے ان پر چڑھے چلے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب ان دونوں سے گنتم گنتھا ہو گئے اور موقع ملتے ہی ان دونوں کے سراسر زور سے ٹکرائے کہ دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یوں چاروں ڈاکوؤں کو کیسے ڈپٹی صاحب نے زیر کر لیا۔

اب ان واقعات کو کم و بیش چالیس سال ہو گئے۔ ڈپٹی صاحب نیشن پاتے تھے اور اللہ اللہ کرتے تھے، کہ ملک کی سیاسی فضا خراب ہونی شروع ہو گئی۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہونے لگے۔ طالبہ پاکستان مان لیا گیا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ اس نے جلتی پرنیل کا کام کیا۔ اور ہندوؤں کے تعصب کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ لکھو کھہا مسلمان کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ گئے۔ انھی میں ڈپٹی صاحب بھی اپنی ساری عمر کی کمائی بیس ہزار کے نوٹ لے کر پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ان کی بیگم نے کہا۔ "لاؤ نوٹ تھے دو۔ میں انھیں اپنے بیٹے میں سیوں۔" ڈپٹی صاحب کا سامان ٹھولا گیا، خود ان کی تلاشی لی گئی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اپنی بیگم کی ذکاوت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ایک وردی پوش عورت قضاے مبرم کی طرح نمودار ہوئی اور بیگم کو اندر لے گئی۔ وہاں سے بیگم جب برآمد ہوئیں تو ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ پاؤں ڈالتی کہیں تمہیں اور پتہ تا کہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب سمجھ گئے کہ ان پر کیا گزری، مگر خاموش رہتے ہی میں عاقبت دیکھی۔ بیگم دھم ہو کر رہ گئی تھیں۔

جب جہاز میں سوار ہو گئے اور جہاز اڑ گیا تو ان کا خوف اور صدمہ کچھ کم ہوا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ ڈپٹی صاحب نے بہت سمجھایا۔ اتنا سمجھایا کہ خود بھی آپ دیدہ ہو گئے۔ مگر بیگم کو بیس ہزار کا دھاکا کچھ ایسا بیٹھا کہ گم صم ہو کر رہ گئیں۔ کراچی میں بیٹی داماد نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے لیے آنکھیں بچھائیں، مگر بیگم اپنے ادا سائوں میں نہ آئیں اور ایک دن ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور چند گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ڈپٹی صاحب ہمت کے آدمی تھے مگر دس بیس نہیں اکٹھے بچپن برس کا ساتھ تھا۔

بڈھے کی بیوی مرحائے تو بڈھے کی مٹی پلید ہے۔ پہلے روپیہ گیا، پھر بیوی گئی۔ عمر کے ساتھ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے۔ نماز پڑھتے اور آہ و زاری کرتے کہ "یا اللہ! مجھے بھی جلد اٹھالے۔" سعادت مند بیٹی اور داماد ان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتے تھے، مگر ڈپٹی صاحب پرانی وضع کے بڑے نکیلے آدمی تھے۔ وہ اس غم میں گھلے جاتے تھے کہ ہاٹے۔ میں بیٹی کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا ہوں، اس سے تو موت اچھی۔ مگر موت بھی تو اپنے اختیار میں نہیں۔ فرماتے تھے۔ "شاید قسمت میں ابھی اور ذلتیں اٹھانی لکھی ہیں۔"

ڈپٹی صاحب اب اسی کے پیٹے میں آگے تھے۔ وہی ڈپٹی صاحب تھے جو تیر کی طرح سیدھے تھے، اب کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ دونوں آنکھیں بن چکی تھیں اور ان پر موٹے شیشوں کی بینک چڑھ گئی تھی۔ اونچا سننے لگے تھے۔ ایک دفعہ میں بات نہیں سمجھتے تھے۔ سیاہ گل چھوٹوں کی جگہ سفید گول بڑی سی ڈاڑھی تے لے لی تھی۔ گٹھیانے جوڑوں کو جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ طبیوں کا مشورہ تھا کہ چلتے رہو۔ بیٹھ گئے تو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ لہذا ڈپٹی صاحب روزانہ صبح شام لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے۔ دس بیس قدم چلتے اور بیٹھ جاتے۔ پھر چلتے پھر بیٹھ جاتے۔ غرض یوں ہی اٹھتے بیٹھتے گھر سے بازار تک ہوا آتے۔

پچھلے سال جاڑوں میں ڈپٹی صاحب کو دیکھا کہ ایک ڈھیلا ڈھیلا سامیلا اور کوٹ پہنے لکڑی کے سہارے ڈگمگاتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ پوچھا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟" میں نے نام بتایا۔ یوں۔ "ایں؟" میں نے اونچی آواز میں پھر نام بتایا۔

کہنے لگے۔ "بھئی ہمارے خیر خیر لینے رہا کرو میاں شاہد۔ ہم پکے پان ہیں، نہ جانے کب بلاوا آجائے۔"

میں نے کہا۔ "میں حاضر ہوں۔ لائیے رکابی مجھے دیکھیے، میں لیے چلتا ہوں۔"

نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بولے۔ "اچھالے لو، تمہیں زحمت تو ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "جی بالکل نہیں۔ بلکہ عین سعادت۔"

بولے۔ "کیوں نہ ہو۔ دلی والے ہو، اور ادیب ہو! تمہارے دادا مجھے یوں یاد ہیں جیسے

کل کی بات ہو۔" اور پُرانی باتیں کرتے ٹھسکیاں لیتے وہ گھرنک پہنچ گئے۔ گھر کیا تھا، کوارٹر کے

برآمدے میں ٹاٹ کے پردے ڈال کر کوٹھری سی بنالی تھی۔ اسی میں اُن کا جھلنگا پڑا ہوا تھا۔ جس

پر بوسیدہ سی توشک اور میلا سا لحاف پڑا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے

کہا۔ "بیٹھ جاؤ، آج ہم تمہیں ایک مزے دار کہانی سناتے ہیں۔ جی چاہے تو کبھی لکھ بھی دینا۔

لاؤ۔ یہ رکابی مجھے دو۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیجیے۔" میں نے اب دیکھا کہ رکابی میں مکئی کی روٹیاں

تمہیں اور اُن پر سرسوں کا ساگ رکھا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "حضرت سلامت، یہ آپ کہاں سے لے آئے اور اسے آپ کیسے

کھائیں گے؟" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "ارے بھائی یہی تو بتانے کے لیے تمہیں اپنے ساتھ

لایا ہوں۔ سنو:

آج جب میں بازار سے لوٹا تو حسبِ معمول رکتا رکاتا چلا آ رہا تھا۔ راستے میں جہاں

ایک جھونپڑی ہے نا، وہاں دم لینے کے لیے میں ایک پتھر پر ٹیک گیا۔ کھانسی زور سے اٹھی،

اتنی کہ سانس بے قابو ہو گیا۔ کھانسی اور ہائے ہائے کی آواز سن کر جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر

ایک عورت نے جھانکا۔ "اے ہے، بے چارا، بابا تمہک گیا۔ بھوک لگی ہے؟" یہ کہہ کر جھونپڑی

میں اندر چلی گئی۔ پھر جلدی سے واپس آ کر بولی۔ "بابا، جانیو مت۔ میں نے ابھی ہنڈیا اتار کر

تو رکھا ہے۔" وہ پھر چلی گئی۔ مرعاً میرے دل میں خیال آیا کہ یہ عورت مجھے فقیر سمجھ رہی ہے۔

کیا اللہ کی شان ہے! یہ بڑھاپا نہیں، بُرا آپا ہے۔ اور مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ بہت ضبط

کیا مگر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں اس نے پردے میں سے ہاتھ بڑھا کر

ایک پیڑھی میرے آگے ڈال دی۔ "اے اس پر بیٹھ جا۔ پتھر ٹھنڈا ہوگا۔" پھر میرے آنسو بہتے

دیکھ کر جیسے بچے کو چمکارتے ہیں، چمکار کر بولی۔ ”رو مت بابا۔ میں تجھے گرم گرم روٹی کھلاؤں گی اور ہاں سرسوں کا ساگ بھی، نہ رو۔ بس ابھی لائی۔“

اپنی زبوں حالی پر شرمناکگی و تاسف تو ہو ہی رہا تھا کہ اللہ! اب ہم ایسے ہو گئے کہ لوگ ہمیں فقیر سمجھ کر مہیک کے ٹکڑے دینے لگے! عزیزت نے لکارا اور طبیعت میں بڑی جھونجھل آئی۔ وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ اس کے روٹی لانے سے پہلے چلا جاؤں مگر اس عورت کی ہمدردی اور خلوص نے ایک ایک پاؤں من من بھرا کر دیا۔ دل نے کہا۔ اس ناشائے عبرت کا آخری سین بھی دیکھ لو۔

ابھی یہ کش مکش جاری تھی کہ ایک مٹی کی رسکابی میں مکئی کی دو سفید سفید روٹیاں اور ان پر مہیا پیں اٹھنا ہوا سرسوں کا ساگ رکھا ہوا نظر آیا۔

”اے بابا، کھالے۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر رسکابی لے لی۔

عورت نے کہا۔ ”مہیں بیٹھ کر کھالے، میں تیرے لیے پانی لاتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مہیں بیٹی، میں گھر لے جاؤں گا۔ وہیں جا کر کھاؤں گا۔“ میرے آنسو بہنے لگے۔ اُس عورت نے چمکار چمکار کر کہا۔ ”اچھا تو گھر لے جا۔ رووے مت نہ۔ تیرا گھر کہاں ہے؟ لائیں تیرے گھر پہنچا دوں۔“

میں نے کہا۔ ”مہیں بیٹی، میں خود چلا جاؤں گا، تمہاری یہ رسکابی شام کو دے جاؤں گا۔“ عورت نے کہا۔ ”نا۔ واپس نہ کیجیو، میرے کئے اور مہنتیری ڈھو بریاں ہیں گی، جو تیرا جی چاہے تو اگلی نوچندی جمعرات کو آ جاؤ۔ جب سے میرا منا ہٹا ہے میں نوچندی جمعرات کو ایک وقت کا کھانا اللہ نام کا نکالوں ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا بیٹی، اللہ تجھے بہت سادے، جو میں جتنا با ضرور آؤں گا۔“

بس میاں، میں وہیں سے چلا آ رہا تھا کہ تم راستے میں مل گئے۔“

ڈپٹی صاحب اتنا کہہ کر رونے لگے۔ یہ وہی ڈپٹی صاحب تھے جن کے پیشاب میں پھر اغ جلتا تھا۔ اور جو زمین میں ٹھوکر ماریں تو پانی نکل آتا تھا۔ آج ان کا یہ بڈرا ہو گیا تھا کہ

لوگوں کو ان پر ترس آتا تھا، اور جھونپڑی والی عورت نے انہیں اللہ والا سمجھا۔ میں نے کہا۔
 ”ڈپٹی صاحب اس عورت کی بھلمتساہرت میں تو کوئی شبہ نہیں مگر یہ سخت روٹیاں بھلا
 آپ سے کیا کھائی جائیں گی؟“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ گھر میں سے ڈپٹی صاحب کی بیٹی کی آواز آئی۔

”آیا جی، میز پر کھانا لگا دیا گیا ہے، آجائیے۔“

ڈپٹی صاحب نے کہا۔ ”بیٹی! آج تو ہم اللہ کے مہمان ہیں۔“

ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کھڑکی میں آکر بولیں۔ ”جی آیا جی۔“

ڈپٹی صاحب بولے۔ ”آج تو ہم یہ کھائیں گے، یہ دیکھو۔“

بیٹی نے کہا۔ ”اے ہے یہ کیا؟ یہ ٹکڑے بھلا آپ سے کھائے جائیں گے؟ کہاں سے لے

آئے ہیں انہیں؟ اور یہ سرسوں کا ساگ! یہاں تک آ رہی ہے نیل کی مھیکر، توبہ!“

ڈپٹی صاحب نے پرعزم آواز میں کہا۔ ”ہم تو بھائی آج یہی کھائیں گے۔ اللہ نے یہ کھانا ہمیں

دلوایا ہے، ہمارے لیے تو یہی من و سلویٰ ہے۔“ بیٹی نے کہا۔ ”اے ہے آیا جی۔ لائیے مجھے دیکھیے۔

اس کے کھانے سے آپ کا جی خراب ہو جائے گا۔ میں نے آپ کی گھی کی روٹی پکا دی ہے۔ آجائیے،

کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

مگر ڈپٹی صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور روٹی کا ٹکڑا توڑ کر ساگ لگا کر کھانے لگے۔ بھلا وہ

ان سے کیا چیتا؟ سوکھ کر کھڑ تک ہو گیا تھا، مگر وہ اسے زہر مار کرتے رہے اور روتے رہے۔ بمشکل دو

ایک نوالے خلق سے انارے اور پانی پی کر بولے۔ ”الحمد للہ! آج بھیک کے ٹکڑوں کا مزہ بھی چکھ لیا۔“

ان کی بیٹی کی تیوڑی پر بل پڑے ہوئے تھے مگر لحاظ میں کچھ نہ کہہ سکتی تھیں، جانتی تھیں کہ

آیا جی کو ضد سوار ہو جاتی ہے تو ادھر کی دُنیا ادھر ہو جائے۔ یہ اپنی من مانی کیے بغیر نہیں مانتے۔

ٹکڑے ٹکڑے دیکھتی رہیں۔ ڈپٹی صاحب نے بیٹی کی طرف رکابی بڑھا کر کہا۔ ”لو بھئی، اسے خالی کر لاؤ۔“

شام کا انتظار کون کرے؟ اور خالی رکابی لے کر لکڑی ٹیکتے ہوئے ڈپٹی صاحب روانہ ہو گئے، خدا

جانے اُس وقت ماضی کی دُنیا میں کہاں پہنچے ہوئے تھے کہ بار بار اس دوہے کو دہرا رہے تھے:

ان نینوں کا یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

مفاست حسین

میری گلی کے ٹکڑے پر ایک کوارٹر کی توڑ پھوڑ شروع ہوئی۔ اس زمانے میں ہماری کالونی کی منتظم سوسائٹی بڑی فعال ہو گئی تھی۔ ذرا کسی نے اپنے کوارٹر کے آگے چبوترا بنایا اور سوسائٹی سے مزدوروں کا ایک ایک دستہ آیا اور کہہ لیں مار کمر چبوترے کو توڑ گیا۔ اب جو ایک سالم کوارٹر کی ڈھائی ڈھوئی دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ پورا کوارٹر ہی کسی نے ناجائز بنالیا تھا۔ جسے سوسائٹی والے اب ڈھوا رہے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ مچلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دو ڈھائی ہزار کوارٹر تو خود سوسائٹی نے بنا کر دیے ہیں۔ ایک محلہ دار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوارٹر بیک گیا ہے۔ اور جن صاحب نے خریدا ہے وہ اسے دوبارہ بنا رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اس کے محلے پر نئی تعمیر شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو منزلہ خوش نما عمارت تیار ہو گئی۔ مکان سے مکیں کا اندازہ ہو گیا۔ دروازہ پر نام کی تختی لگ گئی۔ "مفاست حسین صدیقی"۔

کراچی کی بے تعلقی اور نفسا نفسی مشہور ہے۔ ایک فلیٹ میں رہنے والے کو اس کا علم نہیں ہوتا کہ برابر والے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ جب اس شہر کا دستور ہی یہی ہے تو اپنا بھی یہ حال ہے کہ دو کوارٹر آگے کی خبر نہیں کہ کون رہتا ہے، بس اپنے کام سے کام : ط

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نیٹر تو

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ میرے سامنے جو کوارٹر ہے، اس میں کوئی صاحب آکر آباد ہوئے، بس اتنا معلوم ہوا کہ گوالیار کے کوئی صاحب ہیں، ڈاکٹر صاحب کہلاتے ہیں۔ مگر دو ادرمن کے ڈاکٹر نہیں۔ دن گزرتے گئے، مہینے گزرتے گئے۔ سال گزرنے کی نوبت آگئی۔ روزانہ دن رات میں خدا جھوٹ نہ بلوئے تو ڈاکٹر صاحب سے بیسیوں بار آنا سامنا ہوتا۔ وہ

مجھے دیکھتے ہوئے گزر جاتے اور میں اُٹھیں۔ علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تو میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان پر کیوں تنقید نہ کرنا۔ غرض اسی مختصر میں دن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن صبح کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں اور دیوان خانے میں بیٹھا دیے گئے ہیں۔ دیوان خانے کی کیفیت بھی سن لیجیے۔ میرے کوارٹریں صرف دو کمرے ہیں۔ ایک مستقلاً بیوی بچوں کے تصرف میں رہتا ہے۔ دوسرا کمرہ دن میں "ساقی" کا دفتر اور دیوان خانہ بن جاتا، رات کو بیڈ روم بن جاتا۔ اگر کسی کی دعوت ہوتی ہے تو ڈرائنگ روم بن جاتا ہے۔ اگر موسیقی کی محفل ہوتی ہے تو میوزک ہال بن جاتا ہے، اور اگر کوئی مہمان آجاتا ہے تو مہمان خانہ۔ گھس گھس میسرے کان میں گھس!۔ چوہا ہل میں سماتا نہیں دم سے باندھے پھانچ اور مجھے اس طالب علم کا قصہ یاد آجاتا ہے جس کا ایک تہمد چوری ہو گیا تھا تو اس نے مہمانے میں اپنی ۲۲ چیزیں چوری جانے کی رپٹ درج کرائی تھی۔ کیوں کہ اس تہمد کے ۲۲ مصرف تھے۔ لٹنگ، پگڈھی، بستر، بونبند، چادر، جامناز، دسترخوان وغیرہ وغیرہ۔ اپنا بھی کچھ یہی حال تھا۔

کیا کہوں میسرے اپنے گھر کا حال اس خرابی نے کر دیا پامال

ہاں تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب دیوان خانہ میں آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا۔ "آج کیا جاتی دنیا دیکھی؟" پچھنے کہا۔ "بلا رہے ہیں آپ کو۔"

میں نے کمرے میں داخل ہو کر مؤذبانہ سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی گرجبوشی سے ہاتھ ملایا۔ مزاج پرسی کی اور ہم دونوں اس قدر رفاقت سے ملے گویا ہم سے زیادہ رفاقت دو دوستوں میں مہلا کیا ہوگی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے ایک خط دیا۔ یہ خط مشہور اشنا پرداز ل احمد صاحب کا تھا۔ انہوں نے کلکتہ سے ڈاکٹر صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کو رٹرنمبر ۱۹۱ میں ہیں اور شاہد صاحب نمبر ۱۹۰۶ میں۔ مگر نہ تو آپ نے کبھی کسی خط میں شاہد صاحب کا تذکرہ کیا اور نہ شاہد صاحب نے آپ کا۔ یہ کیا معنی ہے! اگر آپ حضرات اس قریب کے باوجود اب تک نہیں ملے ہیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوگا۔ اپنی ندامت کو چھپانے کے لیے ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اس خط کے بعد ڈاکٹر صاحب سے واقعی مخلصانہ دوستی ہو گئی۔ آپ سمجھے بھی یہ ڈاکٹر صاحب کون تھے؟ یہ تھے ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ علامہ نیاز فتح پوری کے پرانے دوست اور "سنگار" کے مضمون نگار۔ نہایت مستشرق ادبی

ذوق کے مالک! اور دل احمد وہی لطیف الدین احمد اکبر آبادی ہیں۔ جنہوں نے مور کی مثنوی لالہ سرخ کا ترجمہ کر کے شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی اور یہ دونوں حضرات بارانِ نجد میں بھی شامل تھے جنہوں نے اب سے چالیس سال پہلے ”ادبِ لطیف“ کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اچھا تو ذکرِ نفاست حسین کا کہی سال تک اس سے زیادہ معلوم نہ ہوگا کہ یوپی کے کسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور پیسے والے آدمی ہیں۔ کراچی کی بے تعلقی ان سے بھی ملنے میں حاصل رہی یہاں تک کہ مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کا زمانہ آیا۔ ملک فیروز خاں نوٹن کی وزارتِ عظمیٰ کا عمل دخل تھا۔ ان کے ایک قریبی عزیز اپنے افسروں کو پھلانگتے ہوئے کراچی کے پولیس چیف بن گئے تھے۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ انہوں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے محلہ کمیٹیاں بنانے کا ڈول ڈالا۔ شدہ شدہ ہمارے محلے میں بھی ایک کمیٹی قائم کرنے کے لیے پولیس والوں نے ایک جلسہ کیا اور پولیس کے گروگوں نے نام بنام سب کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کی۔ حکمِ حاکمِ مرگِ مفاجات، مجھے بھی حاضر ہونا پڑا۔ محلہ کمیٹیوں کے جو مقاصد بیان کیے گئے وہ اچھے ہی تھے۔ محلے میں امن و امان قائم رکھنا، چھوٹے موٹے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا، بد معاشوں اور بد کرداروں کی اطلاع پولیس کو دینا۔ غرض ہر لحاظ سے پولیس کی نیابت کرنا۔ جب محلہ کمیٹی کے لیے نام مانگے گئے تو کسی نے میرا نام بھی لکھوا دیا۔ میں نے بہت رستیاں تڑائیں مگر میری ایک نہ چلی۔ اور ایک دن میرے نام ایک ہم محلہ کا پروانہ آگیا کہ آج رات کے نو بجے محلہ کمیٹی کی میٹنگ میرے گھر پر ہے۔ جس میں علاقے کے ڈی، ایس پی صاحب خطاب کریں گے۔

نظامِ صاحب کے گھر پر دس بارہ حضرات جمع ہوئے۔ صاحبِ خانہ نے سب کا تعارف کرایا۔ یہیں نفاست صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ بڑے زندہ دل آدمی نکلے۔ بات بات پر کھلے پڑتے تھے۔ تیس کے قریب عمر تھی۔ اونچا قد، چھریا ڈیل، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، بے قرار آنکھیں۔ ان پر سنہرے فریم کی بینک ستواں ناک۔ موزوں دہن۔ گول ٹھوڑی۔ بھلین شیو۔ انگریزی اور اردو ملا کر بولتے تھے اور تنہسی کے نوآرے چھوڑتے جاتے تھے۔ اس سارے اجتماع میں اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے سب سے نمایاں شخصیت انہی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ نظام صاحب اور نفاست صاحب نے مل کر چھاپرخانہ اور کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے کاروبار تیرتا چلا جا رہا ہے۔

ان دونوں ذہین اور مہنتی نوجوانوں کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ورنہ جو لوگ بھارت میں اپنا سب کچھ گنوا کر آئے ہیں، ان میں سے بیشتر اپنی عمر اس نقصان کے سوگ میں بسر کر رہے ہیں۔ نفاست صاحب جس قدر شوخ و شنگ تھے، نظام صاحب اسی قدر سنجیدہ و بردبار، اجتماعِ صدیقین کے بندھن میں جکڑے ہوئے تھے۔

ڈی ایس پی صاحب آئے اور ساتھ علاقے کے انسپکٹر اور سب انسپکٹر بھی آئے۔ محلہ کمیٹی کے مفادِ صدیقان کیے گئے۔ کمیٹی کے فیصلوں اور اختیارات دریافت کیے گئے۔ بہت سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ ڈی ایس پی صاحب، بڑی شرافت سے جوابات دیتے رہے۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ اب کسی اہل محلہ کو تھکانے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تمام جھگڑے اور شکایتیں محلہ کمیٹی ہی آئندہ نمٹایا کرے گی۔ مگر میں پولیس کے نام ہی سے الرجک ہوں، بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ کب یہ جلسہ برخاست ہو اور میں خیر سے اپنے گھر سدھاروں گفتگو ختم ہونے کے بعد محلہ کمیٹی کی باقاعدہ تشکیل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے صدر کے لیے نام مانگا گیا۔ تین چار آوازوں میں میرا نام لیا گیا۔ میں نہیں نہیں ہی کرتا رہا اور سب نے گونٹھ گانٹھ کے میرا نام ہی لکھوا دیا۔ میں نے اپنے غائبانہ قدر دانوں کا شکریہ ادا کیا، اور عرض کیا کہ میں اس عہدے کے لیے قطعی ناموزوں ہوں۔ کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اپنی افتادِ مزاج کے سبب۔ ڈی ایس پی صاحب نے بڑی شرافت سے پوچھا: ”آپ کو صدر بننے پر اعتراض کیا ہے؟“

مجھے حیرت آگیا۔ میں نے کہا: ”میں پولیس کا کتا نہیں بن سکتا۔“

اس جواب پر چاہیے تو یہ تھا کہ ڈی ایس پی صاحب ناراض ہو کر مجھے کسی الزام میں گرفتار کر لیتے۔ مگر انھوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے کہا: ”ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔“ میں نے کہا: ”میں یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے محلے والوں کی خفیہ شکایتیں آپ کو پہنچاتا رہوں۔ میں تمھارے میں حاضر نہیں دے سکتا۔ آپ کے وقت نا وقت طلب کرنے پر پیش نہیں ہو سکتا۔“

انھوں نے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ صرف ٹیلی فون کر دیں، میں

خود حاضر ہو جاؤں گا۔ غرض:

قرعہ فال تمام من دیوانہ زدند

نظام صاحب کو سیکرٹری بنایا گیا اور نفاست صاحب مجملہ دیگر حضرات کے مجلسِ عاملہ کے ممبر بنے۔ اس کمیٹی کے جلسے ہفتہ وار یا حسبِ ضرورت ہونے لگے۔ مگر ان جلسوں میں ص

نشستند و خوردند و برخاستند

کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ کیوں کہ ہمارے محلے میں جو ستر بہتر کو اڑ رہے ہیں، ان میں خدا کے فضل سے سب جیسے لوگ آباد ہیں اور اللہ بھلا کرے بے تعلقی کا کوئی کسی سے ملتا جلتا ہی نہیں، جو بھگڑا ہو۔ جہاں دو برتن ہوتے ہیں، آپس میں کھڑک ہی جاتے ہیں۔ مگر جہاں ص

کسے را با کسے کارے نہ باشد۔

وہاں تو سناٹا ہی رہتا ہے۔ اس محلہ کمیٹی سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ محلے کے دس بارہ افراد میں دو ستر کا رشتہ قائم ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ کمیٹی کے جلسے باری باری سے مجلسِ عاملہ کے ممبروں کے ہاں ہونے لگے۔ جس کے ہاں جلسہ ہوتا وہ یا تو ضیافت کا اہتمام کرتا یا کم از کم بھاری چائے کا۔ کھلانے پلانے میں نفاست صاحب اور نظام صاحب بڑے دبنگ تھے۔ چند مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد پھر کوئی نئی حکومت بن گئی تو وزیرِ اعظم کے ساتھ اس کے لواحقین بھی چلتے کیے گئے اور محلہ کمیٹیاں اپنی موت آپ مر گئیں۔ مگر احباب کا جو حلقہ قائم ہو گیا تھا وہ بدستور قائم رہا۔

اب جو حلقہ قائم ہوا تھا، وہ پولیس کا بنایا ہوا نہ تھا بلکہ دوستوں کا تھا۔ اس کی بنیاد خوف و ہراس پر نہیں، محبت و اخوت پر تھی۔ اس حلقے کے شیرازہ بند عزیز صاحب تھے۔ یہ صاحب تمام ممبروں سے کم عمر تھے اور محلہ کے بڑے سرگرم کارکن۔ تھے تو سرکاری ملازم، مگر ملازمت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ خدمتِ خلق کو یہ ہر کام پر ترجیح دیتے تھے۔ پہلے اٹھنوں نے ہفتہ وار دعوتوں کا سلسلہ یوں شروع کیا کہ تمام ممبر اپنے اپنے گھروں سے اپنا اپنا کھانا لے کر آئیں، اور کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھائیں۔ یہ تجویز بڑی کامیاب رہی۔ ایک تو یہ کہ دسترخوان پر بیسیوں قسم کے کھانے جمع ہو جاتے، دوسرے یہ کہ زیادہ مقدار میں۔ کیوں کہ اس میں نمود کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ اس پیشی کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طے ہوا کہ اگر کوئی صاحب اپنے ساتھ ایک آدھ مہمان لانا چاہیں تو اطلاع دے کر لے آئیں۔ چنانچہ مہمان بھی شریک ہونے لگے۔ اور بیس چپیس افراد کا اجتماع ہونے لگا۔ اس یکا تگت اور دل چسپ صحبت کو دیکھ کر مہمانوں کی آنکھیں مچھلیں اور وہ رشک سے کہتے کہ کاش ہمارا بھی

کوئی ایسا معاملہ ہوتا۔

دہلی میں جب ۱۹۴۰ء کے بعد جنگ کے باعث غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے تو ہم نے ایک دن محلے کی مسجد میں بعد از نماز عشاء محلے والوں کو جمع کیا۔ اور حالات کے پیش نظر ایک انتظامی مجلس بنالی تھی۔ جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے پیسہ دیا اور جو ہاتھ پاؤں سے خدمت کر سکتے تھے ان کی ایک والنٹیئر کوربن گئی تھی۔ کئی سو روپے کا غلہ خرید کر محلے والوں نے میرے گھر میں رکھوا دیا تھا تاکہ نیا بانی کے زمانے میں اہل محلہ کے کام آسکے۔ وہاں بھی ایک مجلس عاملہ بن گئی تھی اور ہفتہ کے ہفتہ کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھانا کھایا جاتا تھا اور شہر اور محلہ کی سیاست پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ محلہ داروں نے ازراہ نفع ہماری انجمن کا نام "انجمن شکم پروران" رکھ دیا تھا۔ یہاں بھی ایک ویسی ہی انجمن بن گئی تھی اور محلے والے اسے پیٹ بھروں کی انجمن کہنے لگے تھے۔ کھانوں کا یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔

انسان کسی حالت پر قانع نہیں رہتا۔ اب یہ ہوا کہ اس کا ڈھرا بدلنا چاہیے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ یاری یاری سے دوستوں کے ہاں دعوت ہوا کرے۔ لہذا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دعوتوں کی روج رواں نفاست حسین ہوا کرتے تھے۔ مزے مزے کی باتیں کر کے خوب ہنستے ہنساتے۔ میری یاری آئی تو نفاست صاحب نے کہا۔ "شاہد بھائی کے ہاں صرف کھانا نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "مہینے چلے یا کافی بھی ہوگی۔"

بولے۔ "وہ تو ہوگی ہی، کچھ اور بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "جو ارشاد ہو۔"

نظام صاحب نے کہا۔ "گانا بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "گانا بھی ہو جائے گا۔ مگر اس گانے کو مجھے گا کون؟ میرے ہاں تو صرف پٹکا گانا

ہوتا ہے۔"

نفاست صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "گانا ہونا چاہیے، پٹکا ہو یا کچا۔ اور ہاں آپ کا گانا

ہم ضرور سنیں گے۔" سب نے ہاں میں ہاں ملائی، اور مجھے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

دعوت والے دن میں نے استاد رمضان خان اور امام الدین کو بلالیا۔ کھانے سے فارغ

ہونے کے بعد رمضان خان صاحب نے نان پورہ سُر کرنا شروع کیا۔ کوئی دس منٹ اس میں لگ گئے۔ احباب کسمسارے لگے۔ مجھے کنگ جارج کے دلی دربار کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں نے احباب کی کوفت دوڑ کرنے کے لیے سنا یا کہ بادشاہ کے پروگرام میں دل بستگی کے لیے طرح طرح کے فنون کی نمائش بھی رکھی گئی تھی۔ مثلاً ایک رات کو آتش بازی چھوڑی گئی۔ دلی کے آتش بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔ میں اس وقت پانچ چھ سال کا تھا مگر اب تک یاد ہے کہ دھماکے کے ساتھ ایک گولا اُپر کو چلا اور آسمان پر جا کر پھٹا تو کنگ جارج اور کوئین میری کی تصویر بن گئی۔ خیر سپندرہ منٹ اس کے بھی رکھے گئے کہ بادشاہ کو یہاں کا گانا سُنوایا جائے گا۔ ریاستوں سے بڑے بڑے خان صاحب آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو کو انتخاب کر کے وقت مقررہ پر بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ طنزوں پر سے محمدیں غلاف اُتارے گئے۔ سازنگی نواز نے سازنگی پر سُر دکھایا اور طربیں ملانے لگے۔ خان صاحبوں نے کھونٹیاں مروڑ مروڑ کر تار ملانے شروع کیے، پھر منکوں سے ملانے لگے۔ ادھر طبلہ نواز نے ہتھوڑی لے کر آٹھوں گھاٹ صحیح کرتے شروع کیے۔ ادھر ساز سُر میں ہوئے، ادھر سپندرہ منٹ ختم ہو گئے۔ بادشاہ سلامت نے ہندوستانی موسیقی کا جو مظاہرہ آج دیکھا تھا، اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور دربار پر خاست ہو گیا۔ اس لطیفے پر سب ہنسنے لگے۔ استاد بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے اور بولے۔ "میاں تاپنورے کے ملانے ہی سے گویے کی جانچ ہو جاتی ہے۔" تاپنورہ مل گیا تو طبلے کی ٹھکانی ہونے لگی۔ مگر لطیفہ اپنا کام کر گیا۔ اس لیے طبلے کے ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میاں امام الدین نے باجا سنبھالا اور خان صاحب نے مالکونس کا خیال اکواٹی میں شروع کر دیا۔ استاد رمضان خان مہر کھنڈر کی گائیگی پر حاوی ہیں۔ انھوں نے جو سُرؤں کے مجموعے بنانے شروع کیے تو اُدھا گھنٹہ ٹیپ تک پہنچنے میں لگا دیا۔ اس کے بعد تان پٹوں کا سلسلہ جو شروع کیا تو سُرؤں کی ایسی تپسی کر کے رکھ دی۔

خدا خدا کر کے ۴۵ منٹ میں خیال ختم ہوا تو سامعین کی جان میں جان آئی۔

سب نے بہت تعریف کی۔ نفاست صاحب نے کہا۔ "استاد آپ نے تو کمال کر دیا۔" پھر فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "اب آپ سُنائیے۔ استاد تھک گئے ہوں گے، انھیں آرام کرنے دیجیے۔" استاد چپک کر بولے۔ "تھک گئے۔ توبہ توبہ کر کے کہتا ہوں،

ابھی تو پانچ گھنٹے اور گاسکتا ہوں۔" یہ سن کر سب کے چہرے فق ہو گئے۔ ایک ہی خیال نے اُن کا پلیمین سکال دیا تھا۔ بڑی بے کسی سے میری طرف دیکھا اور معاً مجھے وہ گائے یاد آگئی جو بقر عید پر نقاست صاحب کے گھر کے سامنے کھڑی تھی مگر کانپ رہی تھی اور قصاب اس کی رستی کھول رہا تھا۔

مجھے اُن پر بڑا ترس آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ گانا حفظِ نفس کے لیے مہینس ہوتا، تزکیہ قلب کے لیے ہوتا ہے۔" آوازیں آئیں۔ "بے شک، بے شک! میں نے کہا۔" دیکھیے، میں آپ کو درباری کا خیال سنانا ہوں۔ سب کے چہرے پھر اتر گئے۔ میں انہیں بطور سزا گانا سنانا چاہتا تھا۔ انہیں بنا دیا گیا تھا کہ پکا گانا ایک بہت بڑی مصیبت ہے، مگر وہ نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ ہم تو پکا گانا ہی پسند کرتے ہیں۔

"لو! تو پھر سُنو!" میں نے درباری کا خیال آدھے گھنٹے میں ختم کیا۔ گانے کے دوران میں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ آہ نہ واہ۔ قبرستان کا منظر پیش نظر تھا۔ جب میں نے دیکھ لیا کہ ان کا اچھی طرح تزکیہ نفس ہو گیا تو خیال ختم کیا اور فوراً کافی منگوا کر سب کو پلوانی۔ ضرب بڑی کاری لگی تھی۔ اسے سہلانا بھی ضرور تھا۔ اس لیے اپنے بعد میاں امام الدین کو بٹھایا انھوں نے فانی، جگر، اور فیض کی غزلیں سنا کر محظوظ کیا۔ اور سب ہنس توشی رخصت ہوئے۔ اگلی دعوت نظام صاحب کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے ایک بالکل نئے انداز کا انتظام کیا تھا۔ یعنی وہ کھانے جو مہین لوگ کھاتے ہیں، انھی کے ایک باورچی سے تیار کر کے اُسے تنھے کھانا سب کھاتے جاتے تھے اور خوش گپیاں ہوتی باقی تھیں۔ نقاست صاحب نے پکے گانے کا ذکر چھیڑا اور ہنس کر کہنے لگے۔ "ہو گا میاں کوئی بڑا اُونچا فن۔ اپنے پتے تو کچھ نہیں پڑا۔ اگر ایسا ہی گانا سنانا ہو تو کسی گنتے کے ڈھیل کیوں نہ مار دیا جائے۔" اس پر ایک فقہیہ پڑا۔ نظام صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "فن تو یقیناً یہ ہے اور بہت اُونچا فن ہے، یہ کہتے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔" نقاست صاحب بولے۔ "یہ بھی کوئی فن ہو گا کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "آپ تجریدی آرٹ کی تصویروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" بولے۔ "نہیں۔" عجیب بھدے بھدے رنگ لگا کر کہتے ہیں کہ یہ شاہکار ہے۔ ایک لطیفہ سنانا تھا کہ کسی ایسے ہی تجریدی آرٹ کے

شناہرکار کو دیکھ کر ہم جیسے کسی انارٹی نے پوچھا تھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اُسے بتایا گیا کہ ”یہ چراگاہ میں گائے چر رہی ہے۔“ اُس نے حیران ہو کر پوچھا کہ سبزہ کہاں ہے، اور گائے کہاں ہے؟ کہا گیا کہ گھاس گائے نے چر لی ہے۔“ اور گائے؟ ”چرنے کے بعد چلی گئی۔“ ابھی حال میں ایک خیر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ کسی نمائش میں ایک تصویر کو پہلا انعام ملا۔ بعد میں مصوّر نے بتایا کہ غلطی سے تصویر الٹی لگا دی گئی تھی۔ ان لطیفوں پر جب سب ہنس چکے تو میں نے عرض کیا۔ فتونِ لطیفہ کو سمجھنے کے لیے اپنے اندر بھی بدھی ہونی چاہیے۔ پتاکا گانا یا تجریدی آرٹ فن کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ فن کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے برسوں مطالعہ و مشاہدہ اور ریاض کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے سولہ سال انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ اس پر بھی ٹیکسپیئر اور ملٹن سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔“

نفاست صاحب بولے۔ ”ہاں! یہ بات تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتائیے آپ نے موسیقی یا مصوری کتنے سال تک سیکھی؟“ بولے۔ ”بالکل نہیں سیکھی۔“ میں نے کہا۔ ”تو پھر آپ اسے کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جیہی تو میں نے کہا تھا کہ پتاکا گانا ایک بہت بڑی مرصیت ہے۔“

”غذاب ہے صاحب۔“ نفاست صاحب سنجیدگی سے بولے اور سب ہنس پڑے۔

”اب کھائی سو کھائی، اب کھاؤں تو رام دہائی۔“ آپ نے اس دن ہمارا پورا تذکیہ نفس کر دیا۔ اب آپ کی طرح ہم بھی ۳۰-۳۵ سال اس فن کو سیکھیں، سنیں اور برہنیں تو اس سے کُطف اندوز ہوں۔ نا بابا نا۔ آپ ہی کو مبارک ہے یہ فن، غرض بڑی دل چسپ گفتگو رہی کھانے کے بعد، اور اگلی دعوت نفاست صاحب کے ہاں طے ہوئی۔

نفاست صاحب کو اللہ نے پیسہ دیا تھا اور پیسہ کے ساتھ دل بھی دیا تھا۔ وہ محنت کر کے خوب کماتے تھے۔ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، آرام سے رہتے۔ دوستوں کی خاطر تواضع پر جی کھول کر صرف کرتے۔ اپنی دعوت سے دو ایک دن پہلے اپنے گھر کے آگے بیٹھے ہوئے مل گئے تھے، فرمانے لگے۔ ”کھانے کے بعد کچھ ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”جیسی رائے ہو۔“ ہنس کر بولے۔ ”پکے سگانے سے تو آپ نے توبہ کرائی۔ آپ کے نو سیکڑوں شاعر دوست ہوں گے۔ کسی اچھے سے شاعر کو پکڑ لائیے۔“

نفاست صاحب کو میری اس کمزوری کا علم تھا کہ میں شاعروں کے نام سے بھڑکتا ہوں۔

اور سنس سنس کہ میرا یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے کہ "میں نے تو شاعروں کے ڈر کے مارے اپنے گھر پر اپنے نام کی تختی بھی نہیں لگائی" اس پر بھی انھوں نے مجھ سے ایک شاعر کو "پکڑ لانے" کی فرمائش کر دی۔

میں نے کہا۔ "ہم کھانے کے بعد کوئی اور برا کام نہیں کر سکتے۔" بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے۔ "آپ کا بھی تو تزکیہ نفس ہونا چاہیے"

دعوت ہوئی اور بڑے مٹھا مٹھ کی ہوئی۔ میں اپنے ساتھ حضرت ظریف دہلوی کو لے گیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، اور چائے کے ساتھ ظریف صاحب کا چٹ پٹا کلام۔ ظریف صاحب مسخرے پن کے شعر بھی کہتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کو نمبروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے نمبر کی شاعری پر ان کا سنجیدہ کلام ہے۔ دوسرے نمبر میں مزاحیہ، تیسرے میں طنزیہ اور چوتھے نمبر پر فحش۔ ظریف صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میں نے ان کی نمبر وار شاعری کا تعارف بھی کرا دیا۔ حاضرین ان کا کلام خصوصاً نمبر ۴ سنسنے کے لیے ہمہ تن گوش بن گئے، مگر ایک دم سے نمبر چار کی فرمائش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا نمبر وار ان کا کلام سنتے چلے گئے۔ جب نمبر چار کی باری آئی تو ظریف صاحب نہ نکر کرنے لگے۔ ان کی عمر ستر سے اوپر ہے۔ ویسے وہ بڑے منہ پھٹتے ہیں، مگر اجنبی لوگوں میں پھر بھی لحاظ مانع ہوتا ہے۔ جب چاروں طرف سے بہت اصرار ہوا تو انھوں نے گونگے کا ایک قطعہ سنایا۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے کیوں کہ ظریف صاحب جب اپنا کلام سناتے ہیں تو خود بھی کلام کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھلا انھیں کون چھوڑتا تھا۔ تاہم نوٹ فرمائشیں ہونے لگیں۔ پھر ظریف صاحب نے تکلف بالائے طاق رکھ کر جو اپنی منظومات سنائی شروع کیں تو اللہ دے اور بندہ لے۔ مادر پدر آزاد شاعری نے چھت اڑادی۔ گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ تک ان کا کلام سنا اور اشتیاق پھر بھی باقی رہ گیا۔ یہ بھی ایک یادگار دعوت تھی، جس کا چیرچا بہیتوں رہا۔

نفاست صاحب دل کے مریض تھے مگر بڑے زندہ دل اور وسیع القلب انسان

لے ظریف دہلوی کا انتقال، جنوری ۱۹۶۵ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔

تھے۔ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔ انگریزی اور اردو کی کتابیں چھاپتے تھے اور ان کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ میں نے چوں کہ خود پبلشنگ کا کام کیا ہے، اس لیے میرا تعلق بیسیوں پبلشروں سے رہا ہے۔ میں نے تو کوئی پبلشر ایسا نہیں دیکھا، الا ماشاء اللہ جو ادیبوں کا شکار نہ کرتا ہو۔ یہاں تو میں نے ایسے ایسے پبلشر دیکھے ہیں کہ میں نے متفکر ہو کر پبلشنگ کا کام ہی چھوڑ دیا ہے تاکہ میں ان کی برادری سے از خود خارج ہو جاؤں۔ نہ رہے بانس، نہ بچے بانسری۔ غضب خدا کا مصنف سے اس کا مسودہ بھی لے لیا اور کتاب کی پوری لاگت بھی، اور اس کے بعد سارا اسٹاک کھا کر ڈکار تک نہ لی۔ بچاڑا مصنف ہے کہ جو تیاں چٹختا مپھر رہا ہے اور کسی کو اس پر ترس نہیں آتا۔

نفاست حسین اس کلبہ سے استثنائاً تھے۔ میں نے ان کی ادیب دوستی کی کئی مثالیں دیکھیں۔ سب سے بڑی مثال تو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۸ سال انگریزی پڑھانے کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آ گئے تھے اور کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبہ انگریزی ہو گئے تھے۔ مقرر ہی ہی مدت کے بعد وہ ریٹائر ہو گئے۔ اور یونیورسٹی سے انھیں علیحدہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بے چارے سیدھے سے آدمی ہیں۔ چھل فریب وہ کیا جانیں، انھوں نے سوچا۔ ملک خداتنگ نیست، پائے مرانگ نیست۔ کسی اور یونیورسٹی میں جگہ مل جائے گی۔ کچھ دنوں بعد پشاور یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی، درخواست دی، انٹرویو کے لیے بلائے گئے۔ نہایت موزوں استاد سمجھے گئے، مگر جگہ نہ ملی۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کراچی یونیورسٹی والوں نے ان کی بُرائی لکھ بھیجی تھی۔ اب انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں دوسری یونیورسٹیوں میں بھی یہی معاملہ پیش نہ آئے۔ ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی سے بھی جواب مل گیا۔ سخت حیران اور پریشان ہوئے۔ پورا برس ساتھ، سات آٹھ سو مہینے کا خرچ۔ ایک مقامی کالج کے مالک نے انھیں زیادہ تنخواہ دے کر پرنسپل رکھنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وضع دار آدمی تھے، انھوں نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ یونیورسٹی کے بعد کالج میں آنا انھیں گوارا نہ ہوا۔

— مگر مارنے والے سے جلانے والا قوی تر ہے۔ اس بے کاری و پریشانی کے زمانے میں

انہیں کتابیں لکھنے کا خیال آیا۔ دو ایک ناول اُدھورے پڑے تھے، انہیں مکمل کیا۔ اپنے مضامین کے مجموعے مکمل کیے۔ پبلشروں کے چکر کاٹے۔ اونے پونے ان کا سودا کیا۔ شدہ شدہ ٹیک کارپوریشن میں بھی پہنچ گئے۔ وہاں نفاست صاحب اور نظام صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے کون واقف نہیں؟ ان حضرات نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو کتابیں تیار تھیں، ان سے لے لیں اور نقد معاوضہ پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ان کا تجربہ تو اب تک یہ تھا کہ جب تک پھیرے کرتے کرتے جوتیاں نہ ٹوٹ جائیں، پبلشر پیسے نہیں دیتا، بلکہ پورے پیسے پھر بھی نہیں دیتا۔ لہذا ان دونوں بھلے آدمیوں سے ڈاکٹر صاحب کی دوستی ہو گئی۔ اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب کی مالی پریشانی رفع ہو گئی۔

بک کارپوریشن کے لیے انگریزی میں وہ تعلیمی کتب اور نصابی کتب کے نوٹس لکھتے رہے۔ ان کے نام کا کھانا کھل گیا۔ اور حسب ضرورت اخراجات کے لیے بک کارپوریشن سے روپیہ لیتے رہے۔ ڈھائی تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کی تھوپی ہوئی بدنامی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے، مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ یونیورسٹی بھلا اپنے فیصلے کو واپس کیسے لیتی۔ اس کے پریسیج کا سوال تھا۔ بڑی بڑی کوششیں کی گئیں، ناکامی ہوئی۔ ادیبوں کا ایک ڈیپوٹیشن بھی وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں باور کرایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ قصور ہے تو انہیں معاف کر دیجیے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یس نے زچ ہو کر کہا۔ "خدا بھی قصور معاف کر دیتا ہے۔" بڑی رعونت سے جواب دیا۔ "جی ہاں، خدا معاف کر دیتا ہے۔" ہم بیزار ہو کر وہاں سے چلے آئے مگر ڈاکٹر صاحب کے دل کو لگی رہی۔ اور ایک دن ڈاکٹر صاحب برے خوش خوش آئے اور کہا کہ داغ بدنامی مٹ گیا ہے۔ مگر میں اب کراچی یونیورسٹی میں نہیں جاؤں گا، سندھ یونیورسٹی میں جا رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ کسی ذریعہ سے بات گورنر تک پہنچائی گئی اور انہوں نے کیس دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کی اس لیے ضرورت پڑی کہ ڈاکٹر صاحب کی صحیح

پریشانی کا اندازہ ہو جائے۔ حد ہے اندھیر نگر کی کہ ایک شخص نے چاروں طرف سے روزی کے دروازے بند کر دیے گئے مگر ظالم بندے یہ بھول گئے کہ رزاق کوئی اور ہے۔ ص :

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی سے سات سو ملے تھے، یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد نفاست و نظام کے ہاں ہزار بارہ سو ملے گئے۔ میں جانتا ہوں کہ بے روزگاری کے تنہوں سے عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب پر کیا گزر گئی۔ ان کی بھوک اور زیندہ اڑ گئی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح دھوپوں میں پھرتے رہتے تھے۔ بنی کے سب سامنے ہیں، بگڑی کا کوئی نہیں۔ مگر زمانہ بھلے آدمیوں سے خالی نہیں رہتا۔ نفاست حسین سنس سنس کہہ کر کہہ کر تھے۔ ”ہم نے ڈاکٹر صاحب پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہمیں کتابیں لکھ لکھ کر دیتے ہیں یہ ان کا احسان ہے۔“ یہ ان کی نیک نیتی ہی تھی کہ ان کا کاروبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور روپے کی لہر مہر ہو گئی۔

نفاست حسین نے تعلیمی کتب کے ساتھ ساتھ ادبی کتب بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لاہور بھی گئے تھے، اور وہاں سے اچھے اچھے ادیبوں کے مسودے خرید کر لائے تھے۔ بزرگ ادیب حضرت ایم اسلم سے پانچ ناولوں کے مسودے لائے تھے۔ غالباً دو شائع بھی کر دیے تھے۔ مگر اسلم صاحب نے بتایا کہ رقم پانچوں کی ادا کر دی تھی۔ ایسے کھرے پبلشر اگر چند اور ہو جائیں تو ادب اور ادیبوں کے دن پھر جائیں۔

نفاست حسین کو اللہ نے روپیہ دیا مگر روپیہ کے ساتھ جو تہا بیاں آتی ہیں، ان سے وہ بچے رہے۔ سارا دن اپنے کام میں لگے رہتے اور بعد مغرب اپنے گھر آجاتے۔ نہ سینما نہ کلب، نہ ہوٹل، کچھ نہیں۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔ اپنے بچوں اور محلے کے دوستوں سے جی مہلاتے تھے۔ کھلانے پلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے، اور خوش ہوتے تھے۔ پیغام چلا آ رہا ہے کہ ایک آئس کریم بنانے والا آ گیا ہے۔ کل شام کو ذرا اس کا ٹیسٹ لیا جائے۔ دس بارہ دوست جمع ہیں اور آئس کریم کا دو چل رہا ہے۔ ایک دن سر راہ مل گئے۔ پوچھا۔ ”آپ کو سیخ کیا پسند ہیں؟“ جواب کا انتظار کیے بغیر بولے۔ ”لاجواب بنانا ہے، ہم کھلوائیں گے آپ کو پرسوں۔“ پرسوں گئے تو دیکھا، صحن میں کبابی بیٹھا سچیں مہر رہا ہے۔ نفاست صاحب

نے پوچھا۔ "کیوں بھٹی کیا دیر ہے؟" جو اب ملا۔ "تیار ہیں؟" ہم میز پر پہنچے اور کباب آنے شروع ہو گئے۔ پیاز کا پچتا، ٹماٹر کے قستے، نیبو طشتریوں میں پہلے ہی رکھا ہوا تھا۔ گرم گرم گولے کے کباب آتے رہے اور روکھے کھائے جاتے رہے۔ چٹ پٹے، مزے دار اور سیروں سے کھائے گئے۔ ہر جہیں کم ہونے پر بھی کچھ تو تھیں ہی، یون کے پانی سے انھیں کم کیا۔ اتنے میں سب کے سامنے گاجر کا حلوہ آ گیا۔ بار لوگوں نے کہا۔ "پہلے سے کیوں نہ بتایا کہ اس کے لیے گنجائش رکھی جاتی؟" صاحب خانہ نے ہنس کر کہا۔ یہ اپنی جگہ خود بنا لے گا۔ "چلیے صاحب، منہ بھی میٹھا ہو گیا۔ مگر نہیں، ابھی نہیں۔ اب چل کر دیوان خانہ میں بیٹھیے، چائے کی ایک ایک پیالی پیجیے، پان کی گلوری منہ میں رکھیے۔ سگریٹ لیجیے اور گپ لڑائیے۔ ملک، حکومت، محنت کی سیاست پر گفتگو کیجیے۔" جب اس سے جی بھر جائے تو اپنے گھر سدھا ریے۔

ایک دن پیغام پہنچا کہ بمبئی کا ایک گانے والا آیا ہے۔ رات کا کھانا یہیں کھائیے اور گانا سنیے۔ بمبئی کا گانے والا۔ اور نفاست صاحب کے ہاں! یہ کیا معما ہے۔ رات کو پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب خالص میراثی وضع میں کفنائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں دیکھا۔ ارے اسے تو میں نے کہیں دیکھا ہے! وہ بھی کوئی آدھے منٹ تک مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد "ارے شاہ صاحب" کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اب حیران ہونے کی باری نفاست صاحب کی تھی۔ جب ہم بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔ "زہے نصیب، یہ صورت پندرہ سال بعد دوبارہ دیکھی مگر میاں آپ یہاں کہاں؟" میں نے کہا۔ "میں یہیں رہتا ہوں، نفاست صاحب کا پڑوسی ہوں؟" دراصل یہ بے چارہ ایک معمولی سا آرٹسٹ تھا جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے غزل گیت گایا کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں کراچی آ گیا مگر یہاں اس وقت ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔ اس لیے بمبئی چلا گیا۔ وہاں اُس نے اچھے پیسے کمائے اور فلموں میں اپنی جگہ بنالی۔ یہاں اپنی لڑکی سے ملنے آیا تھا تو اتفاق سے نفاست صاحب کے ہتھے چڑھ گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جو اس سے گانے کو کہا تو اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "نا، بابا، نا۔ میں بھلا ان کے سامنے کیا گاسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آپ شوق سے گائیے، آپ کو سنے ہوئے پندرہ سال ہو گئے۔" تو اُس نے بڑے ادب لحاظ سے چند غزلیں اور گیت سناٹے۔ اس کے

بعد معلوم ہوا کہ وہاں بہت اچھے حالات ہیں۔ یہ تو اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ یہاں کا حال پوچھا۔ میں نے دینی زبان سے کہا۔ ”اچھا ہے۔“ میں اسے کیا بتانا کہ استاد رمضان خاں بنیانی کھو کر لالو کھیت میں بھوکا مر رہا ہے۔ اپنا گھٹنا کھولو اور آپ ہی لاجوں مرد۔“

محرّم میں نفاست صاحب کے ہاں ایک دن حلیم ضرور کھانی جاتی تھی۔ وہ اس کا خاص اہتمام کرتے تھے اور کئی دیگیں پکوا کر تقسیم بھی کرتے تھے۔

نفاست صاحب ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ مگر دل کی بیماری انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاٹے جا رہی تھی۔ انہیں دورے پڑنے لگے تھے۔ پہلے طویل وقفوں سے، پھر قلیل وقفوں سے۔ ایسا بھی ہوا کہ شدید دورہ ٹرا تو ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں سے چند روز بعد سانسے ہو کر آگئے۔ اب جو ان پر دورہ پڑتا، ہم سمجھتے کہ کوئی بات نہیں، اچھے ہو جائیں گے۔ مگر ایک دن صبح ہی صبح سنا کہ نفاست حسین کا انتقال ہو گیا۔ بھگا ہوا ان کے گھر گیا تو رونے پینے کی دردناک آوازیں سنائی دیں۔ معلوم ہوا کہ صبح اسپتال میں جان دے دی۔ دو گھنٹے بعد پھر گیا تو ان کی میت کو غسل دیا جا رہا تھا۔ نفاست حسین تختے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان پر پانی کے تریڑے پڑ رہے تھے۔ مگر وہ بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ بیماری یا موت نے ان کے جسم اور چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا ان کی آنکھیں نیم باز تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ۔

نشانِ مردِ مومن یا تو گویم،

چو مرگ آید تبسم بولب اوست

(۶۱۹۶۵)

وے صورتیں الہی کس دس بستیاں ہیں

اب سے پچیس تیس سال پہلے دہلی میں میں نے جن بزرگوں کو دیکھا اور ان سے قریب ہونے کا بھی مجھے موقع ملا، ان میں سے بیشتر تو اللہ کو پیارے ہو گئے، باقی جو ہیں (اللہ انہیں ہراری عمر دے) وہ چہرہ سحری ہیں۔ ان بزرگوں کے دم سے دہلی کچھ نہ رہ جانے پر بھی دہلی ہی تھی۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ ان کے دم قدم سے اگلی وضعداریاں قائم تھیں۔ دہلی کی تہذیب زندہ تھی۔ دہلی کی زبان ہانکے پکارے کہہ رہی تھی کہ "میری گل افشانی اب دیکھ لو، پھر تمہاری آنکھیں ڈھونڈا ہی کریں گی۔ میری ایسی من موہتی باتیں اب سن لو، ورنہ کان ترستے ہی رہیں گے۔ میرے جادو کا اثر محسوس کر لو، بعد میں تمہارا دل پھٹتا ہی رہ جائے گا۔"

وہ شکلیں ایک ایک کر کے مٹ گئیں۔ ان کی یاد بھی اب دھندلی پڑ گئی۔ ان کے نورانی چہرے ماضی کے دھند لکوں میں چمکتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر ان کے نقوش مدھم اور ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ میں یاد کا چراغ جلا کر ان مقدس شکلوں کو دیکھتا ہوں تو خواب کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ خواب، یہ سائے بھی نہ مٹ جائیں، کہیں عہدِ رفتہ کی بھول مہلیوں میں نہ کھو جائیں۔ اس لیے ان کے دھندلے نقوش نذر "نقوش" کرتا ہوں۔ یہ طاقِ نسیاں کے چند مٹے مٹے سے نقش و نگار ہیں۔ کاش کوئی انہیں اُجاگر کرے! (شاہد احمد دہلوی)

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کافن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دہلی کے آخری داستان گو میر باقر علی

تھے جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی سی ڈاڑھی سر پر دوپٹی، پاؤں میں دلہی جوتی، انگڑے کھا اور چست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان۔ کھلتا ہوا رنگ، سواسی ناک، میانہ قد، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھرتے۔ داستان سنانے دُور دُور جاتے تھے۔ رجوڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مرگیا تو دلی واپس آگئے۔ اہلی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سینما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پرسنل ختم ہو گئی۔ دلی کے ہندو رئیس چھٹا مل کے ہاں کسی وقت میں چالیس سچاپس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھٹا مل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سنانے رہے ہیں۔ بیس سچاپس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فرانس خانہ میں داستان سنانا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستان امیر حمزہ ہی سنانا کرتے تھے۔ ایک نے ان سے پوچھا کہ میر صاحب! یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں ایک دفعہ۔"

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً انھی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور منی کہ بادشاہ کوروزانہ داستان سنانا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اس نے تنگ آکر کہا۔ "آج پردہ اٹھ جانا چاہیے" تب کہیں وہ پردہ اٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں۔ زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں تام گنا جاتے۔ پھر یہ بھی بناتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں بھٹیاریاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھینچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایک ٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجہ سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں، ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑھتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجینق کو بیان کرنے ہی میں سپدرہ منٹ صرف کر دیے۔ عورت کا حسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور کچھ نہیں تو چپالی کی ہی سیکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا، بیگم دہلیز نہیں مچھلا نکلتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اُپر آنے یا اُکتانے لگیں۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔ بہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اُستادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور تو اور جب دلی میں جلیبہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش سمجھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پر قالین اور گاڈنگیہ ہوتا۔ مین گاڈنگیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دور چلتا رہتا۔ گریوں میں شربت اور جڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے روٹی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اُسے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون دھل کر پانی میں آجاتی تو روٹی اکال دان میں مچھینک دیتے اور گھولوے کی چُسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو پھر داستان شروع کر دیتے۔"

دلی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے پھر ایک دو روپے ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کر دی۔ اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آجاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوار روپیہ مل جاتا۔ بعض دفعہ سامعین کی حسب فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے۔ اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ آجاتا۔ کوئی کہتا۔ میر صاحب آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں۔ اور میر صاحب عیادوں کے کارنامے بیان کرنے لگتے۔ میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سُننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو کے آگے کتاب کھلی دھری ہے۔ اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور بہت ہوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اُونچا کر لیتے ہیں طبیعت بڑی سکندر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی میاں آجاتے تو کلکتہ والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کیسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کو لوٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔ قصہ مختصر، میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ بٹور بٹور کر کہتا تھا:

”حضور یہ اعجاز ہے۔ حضور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔“

جب داستان سُننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں۔ مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ ”گاڑے خاں نے مسلم جان کو طلاق دے دی“ ”پاجی پڑوس“ ”مولانا بخش ہا مہتی“ اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں۔ جو ایک بار چھپنے کے بعد پھر نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ مگر جو لطف ان کی تقریریں تھا، تحریر میں نہ آسکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر پیرا کے شاگرد تھے۔ جن بندگوں نے میر پیرا کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاستنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہو گا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس میرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دہلی کا کامل الفن آنرہی داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لیے چھایا بیچتا تھا۔ طے لے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

میر جالب دہلوی

میر جالب دہلوی میر باقر علی کے ایک عزیز دوست تھے۔ قد و قامت میں انہی جیسے۔ صورت ڈسکل اور وضع قطع میں بھی ان سے مشابہ۔ اتنا بڑا صحافی اردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ کتابیں پڑھنے کا انہیں بچپن سے شوق تھا۔ جو کتاب، رسالہ، اخبار ہاتھ لگ جاتا، اُسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتے۔ اخباروں کے اشتہار تک نہیں چھوڑتے تھے۔ بازار میں کوئی چھپا ہوا کاغذ پڑا مل جاتا تو اسے اٹھالانے اور گھرا کر اُسے پڑھتے۔ مغرب گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لیے بچوں کو پڑھاتے۔ اس زمانے میں سستے ناولوں کے ترجموں کی مانگ تھی۔ میر صاحب نے اس کام کی طرف بھی توجہ دی۔ مولوی عنایت اللہ اور قاری مہر فراد حسین سے مشورہ اور اصلاح لینے لگے۔ یوں ترجمہ کرنے کی بھی انہیں اچھی مشق ہو گئی۔ اب انہیں اخبار نویس کی پیشگی لگی۔ دہلی میں اس وقت کوئی قابل ذکر اخبار نہیں تھا۔ اس لیے میر صاحب لاہور پہنچے اور ایک اخبار میں تیس روپے پر ملازم ہو گئے۔ اس تیس روپے سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی اور مرتے دم تک وہ ترقی ہی کرتے چلے گئے۔ انتخاب لاجواب، پسیہ اخبار اور وکیل کی ادارت نے ان کی منفرد حیثیت قائم کر دی۔ جب مولانا محمد علی نے دہلی سے ہمدرد جاری کیا تو میر صاحب کو اپنے اخبار میں بلایا۔ میر صاحب مشین کے کابلے سے لے کر چھپے ہوئے پرچے کی تقسیم تک ہر کام سے واقف تھے۔ ایسا کام سنبھالا کہ مولوی محمد علی بالکل نچنت ہو گئے۔ ہمدرد کے بند ہونے پر میر جالب کلکتہ چلے گئے۔ جب لکھنؤ سے راجہ صاحب محمود آباد نے ہمدرد نکالا تو اُس کی ادارت کے لیے راجہ صاحب کی نظر انتخاب میر صاحب ہی پر پڑی۔ ہمدرد کے بعد میر صاحب نے اپنا اخبار ہمت جاری کیا جو ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوا۔ میر صاحب چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ ہر چیز کے متعلق ان کی معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ اس پر اگر

کوئی ان کی تقریریں لے تو چھوٹی موٹی کتاب تیار کر لے۔ لوگ ان سے کوئی سوال پوچھ کر گنہگار ہو جاتے تھے میر صاحب کا لیکچر شروع ہونے کے بعد ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ میر صاحب بہت باقاعدہ آدمی تھے۔ ردی سے ردی اخبار کو بھی پڑھتے تھے اور اس کا فائل بنا لیتے تھے۔ جتنے خط ان کے پاس آتے تھے سب کو محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے کتب خانہ میں کئی ہزار نایاب کتابیں تھیں۔ افسوس کہ میر صاحب کے انتقال کے بعد ان کا سارا بیش قیمت سرمایہ یا تو دیمک نے کھایا یا چوڑھے میں جھونکا گیا۔ غالباً پانچ ہزار کتابیں ان کے پوتے جمیل جالبی نے جامعہ ملیہ دہلی کو دے دی تھیں۔ وہ اگر محفوظ ہوں تو ہوں، باقی سب کچھ خاک میں مل گیا۔ میر باقر علی سے یونہی علم اور برینٹے انیون تعلق خاطر تھا۔ اور ہاں حقیقہ باز بھی دونوں تھے۔

شمس العلماء مولوی عبد الرحمن

مولوی صاحب مشن کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، مگر بڑے لدھڑ اور سُست آدمی تھے۔ مگر کبھی نام و نمود کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ بہت کچھ لکھ سکتے تھے مگر کچھ نہ لکھا۔ نہ جانے "مرآة الشعر" بھی کیسے لکھ گئے۔ کالج میں یہ "بڑے مولیٰ سب" کہلاتے تھے۔ ان کی سنجیدگی، بردباری اور اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے بیسائی پرنسپل تک ان کا احترام کرتا تھا۔

میں نے جب انگریزی ادب میں بی بی لے کیا تو خیال ہوا کہ اب فارسی ادب میں ایم لے کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی تھے جو ڈاکٹر بیٹ کے لیے ولایت گئے ہوئے تھے۔ کالج میں ایک نئے پروفیسر آگرہ سے آئے تھے۔ انہوں نے نظامی پڑھانا شروع کیا۔ وہاں بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ چھوٹے ہی عربی کا شعر آگیا۔ پوچھنے لگے "مولانا آپ کو عربی آتی ہے؟" میں نے کہا "نہیں"۔ بولے "مجھے بھی نہیں آتی۔ آپ عربی کے شعر بڑے مولوی صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی قصاب قانی پڑھانے بیٹھے۔ ان سے اشعار کے معنوں میں اختلاف ہوا تو بولے "ہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بہتر معنی یہی ہیں۔ آپ تو خود اچھی فارسی جانتے ہیں۔ کوئی شعر دشوار معلوم ہو تو پوچھ لیا کیجیے۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے

دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔ فارسی والے مولوی صاحب نے کچھ دن تو کام چلایا، پھر وہ کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ بڑے مولوی صاحب سے کہیں بننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لڑکے ان کے رُعب میں ہی سرے جاتے تھے۔ میں بھی کچھ تنگ ہی آگیا تھا۔ جان پر کبیل کر مولوی صاحب سے اسٹاف روم میں ملا، اور انھیں بتایا کہ کوئی پڑھانے والا نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا: "آپ میرے گھر آجایا کیجیے مگر بہت سویرے آنا پڑے گا، صبح کی نماز کے فوراً بعد۔" میں نے بہ جبر اسے منظور کیا اور مولانا کے گھر سو راج نکلتے ہی پہنچ جاتا۔ مولانا نے چند مہینے میں "وقائع نعمت خان عالی" اور "اخلاقِ جدالی" دو کتابیں پڑھائیں۔ دوسری کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رمضان شریف آگئے۔ مولانا روزے رکھتے تھے۔ میں اب گویا ان کے آرام میں محفل ہونے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک کبیل تانے پلنگ پر پڑے رہتے اور میں یہ آواز بلند پڑھتا رہتا۔ جہاں اٹکتا وہ فر فر فر آگے بڑھ جاتے۔ ایک دن پہنچا تو ایک اور شان دار بزرگ ان کے پاس بیٹھے دکھائی دیے۔ بڑی بے تکلف اور مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی یہی جھینک رہے تھے کہ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے اور مولوی صاحب انھیں یہ لطائف الجیل ٹال رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مہین تھے۔

ایک دن میں حسدِ دستور پڑھ رہا تھا اور مولوی صاحب کبیل تانے پڑے تھے کہ کسی عربی کے فقرے پر اٹک گیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "لڑکے کیوں گئے؟" میں نے کہا۔ "جی عربی ہے۔" بولے۔ "تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "جی ممکن ہے کوئی قرآن کی آیت ہو، غلط پڑھ جاؤں گا۔" فرمایا۔ "آپ پڑھیے، عذابِ ثواب مجھ پر ہوگا۔" میں نے بھی دھڑکے عربی کو اردو کی طرح گھسیٹ ڈالا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "سبحان اللہ، سبحان اللہ! مولوی ندیر احمد کے پوتے اور قابلیت کا یہ حال!" اُس وقت ہم اپنے آپ کو بڑا قابل سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب کا کہنا بہت بُرا لگا۔ پھول کر بیٹھ گئے۔ اب مولوی صاحب لاکھ کہتے ہیں۔ "ہاں صاحب پڑھیے۔ ارے بھائی آگے چلو۔" مگر یہاں گم صم بیٹھے تاؤ کھا رہے ہیں۔ مولوی صاحب سمجھ گئے کہ صاحب زادے اکڑ گئے۔ اٹھ بیٹھے اور کبیل ہٹا کر بولے۔ "بہت غصہ آتا ہے آپ کو؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں، آتا ہے۔ یہ کوئی میرا قصور ہے کہ میں مولوی ندیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟ نہیں آتی عربی مجھے؟" فرمایا

”ارے بھی تو میں نے کیا تمہیں منع کیا ہے، عربی بھی پڑھ لیا کرو“ میں نے کہا۔ ”بس مولوی صاحب۔ پڑھائی تو آج ختم ہو چکی۔ کل سے میں نہیں آؤں گا“ مولوی صاحب مجھے مذاق سے کہہ رہا ہوں۔ منس کر چیکے ہو رہے۔ مگر میں اس دن کے بعد نہ تو مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج۔ کئی دن بعد میں اپنے ماموں کے ساتھ لال کنویں سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے مولوی صاحب آنے دکھائی دیے۔ ماموں سے ان کے دیہینہ مراسم تھے۔ اس لیے وہ لپک کر مولوی صاحب کی طرف چلے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ماموں نے سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب نے فرمایا۔ ”ہنیں، پہلے ان سے،۔۔۔ یہ دُٹھے ہوئے شاگرد ہیں“ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا مولوی صاحب نے کہا ”ہاں بھی استاد زادے ہیں ہمیں تو ان کا احترام ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے“ گویا اوپر سے پانچ جوڑتے اور مار دیے۔ ماموں نے بعد میں بتایا کہ مولوی صاحب نے تمہارے دادا سے بھی ایک زمانے میں پڑھا ہے۔ اس وقت کے بعد مولوی صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ انہوں نے ساتی کے لیے کچھ لکھا بھی مگر تعلیم کا دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد مولوی صاحب کو کراچی میں دیکھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر بن گئے تھے۔ انہیں مشن کالج والوں نے۔ خوشامدانہ ”دیا تھا۔ مولوی صاحب ڈاکٹر اشتیاق کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ اس لیے انہیں خاص طور پر جا کر لایا گیا تھا۔ میں نے کوئی بیس سال کے بعد مولوی صاحب کو دیکھا۔ بالکل سُوکھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ بہرے بھی ہو گئے تھے۔ میں آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گیا۔ ان کے لڑکے نے پیچ کر ان کے کان میں کہا ”شاہد احمد دہلوی ہیں“ فرمایا۔ ”اچھا!“ پھر بڑی محبت سے دیکھ کر بولے۔ ”بھائی، اندھا ہو گیا، بہرا ہو گیا، معاف کرنا“ میرا دل بھر آیا، کچھ نہ کہہ سکا۔ بس یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ کسی نے بعد میں بتایا کہ وزیر جہا بہرین شاگرد ہیں۔ مگر مولوی صاحب کے پاس رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ کسی نے توجہ بھی دلائی مگر دعا قبول نہ ہوئی۔ مالی دشواریوں، بیماریوں اور سخت پریشانیوں میں چند مہینے ہوئے یہ آفتابِ علم و ادب کراچی کے ایک بوسیدہ سے کمرے میں غروب ہو گیا۔

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی

خواجہ میر درد کی بارہ درمی کسی زمانے میں بارہ درمی ہو تو ہو، ہم نے توجیب سے ہوش

سنجھالا اس بارہ درمی میں چند پُرانے گھر وندے ہی دیکھے۔ انہی گھر وندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر زبیر فراق دہلوی رہتے تھے۔ میں نے بچپن میں انہیں اپنے والد کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ سُرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں ڈاڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل، انگشتنیا ننگندے پُراہو اور غل، سر پہ کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا، اور بہت تھا مگر خود ہی لکھتے۔ ان کی تحریر قسمت کی تحریر ہوتی تھی کہ پڑھنے ہی میں نہ آتی۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ان کے ہاں جانے کا پہلا اتفاق ہوا۔ پتا پوچھتا پوچھتا ان کے گھر پہنچا۔ کنڈھی کھٹکھٹائی، غالب کہیں قریب تھے، خود ہی دروازے میں آگئے۔ مجھے جانتے نہ تھے، پوچھا۔ ”کون ہو بھائی؟“ میں نے اپنا نام بتایا، کوئی اثر نہ ہوا۔ باپ کا نام بتایا، بے قرار ہو کر سینے سے لگایا۔ برابر والی مردانی بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا۔ بولے۔ ”تم تو بھتیجے ہو۔ تمھارے ابا مجھے سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہائے اب وہ اگلی سی وضع داریاں کہاں! اچھا تاؤ گھر میں تو سب خیریت ہے؟ تم آج کیسے آئے؟“ میں نے کہا۔ ”ایک ادبی ماہنامہ دتی سے جاری کرنے کا ارادہ ہے۔“ پوچھا ”نام کیا رکھا؟“ میں نے کہا۔ ”ساتی۔“ خوش ہو کر بولے۔ ”اچھا نام ہے۔ بدہ ساتی مے باقی کہ درجنت نہ خواہی یافت۔“ بیسیوں شعر ساتی کے سنا ڈالے۔ ”ہاں بھئی ساتی کے لیے ضرور لکھوں گا، بھتیجے کے لیے ضرور لکھوں گا۔“ نثر بھی اور نظم بھی۔ اتنے میں ایک ان سے بھی زیادہ معمر بزرگ بیٹھک میں در آئے۔ کمر خنداروں کا سائب دلہیہ۔ دروازے ہی میں سے پھلکاپن شروع کر دیا۔ بارے ایک غیر آدمی کو دیکھ کر سنبھل گئے۔ فراق صاحب نے کہا۔ ”بھائی بشیر کے صاحب زادے ہیں۔ رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔“ مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی اور فراق صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فراق صاحب نے کہا۔ ”اب دتی میں کیا رہ گیا ہے؟ نظم میں تم ہو، نثر میں میں۔ باقی اللہ کا نام ہے؟“ میں نے چونک کر ان بزرگ کی طرف دیکھا۔ وہ دو باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ ان کا قدم دہلیز سے باہر نکلا ہی تھا کہ فراق صاحب نے کہا ”اور یہ بھی کیا ہیں، بس میں ہی رہ گیا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”یہ کون صاحب تھے؟“ بولے ”تم انہیں نہیں جانتے؟ اماں بے خود دہلوی تھے۔“

اسی مہول پن میں بعض باتیں بڑی عجیب بھی کہہ جاتے تھے مثلاً یہ کہ لال قلعہ حبیب بن رہا تھا

تو لوہے کے بڑے بڑے کڑھاد پھیرے ہوئے تھے۔ ان میں پھر بی کھولتی رہتی تھی۔ اینٹ بنانے کے بعد پہلے اس چربی میں پکائی جاتی۔ جب وہ خوب سُرخ ہو جاتی تو اسے نکال کر دیوار میں چن دیا جاتا۔ فرماتے تھے کہ سُندربن میں ہم نے ایک پرندہ ایسا دیکھا جس کا صرف ایک پر تھا۔ دوسرے پر کے بدلے بڈی کا صرف آنکڑا سا تھا۔ نو کا دایاں پر ہوتا ہے اور مادہ کا بایاں۔ جب انہیں اڑنا ہوتا تو نر اور مادہ آنکڑے میں آنکڑا اڈال کر پھیر سے اڑ جاتے۔ ان کی ایسی بے پر کی اڑانے میں بھی ایک لطف تھا۔

ناصر زبیر فراق کوئی چار سال اور جیے مفلسی اور بڑھاپے نے ان کا دھڑ توڑ رکھا تھا۔ ساقی کے لیے انہوں نے قسط دار "لال قلعہ کی جھلک" لکھی۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ محزون کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جب محزون بند ہو گیا تو انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ساقی کے لیے لکھا لکھنے میں انہیں بڑی زحمت ہوتی تھی مگر مرتے دم تک اپنی وضعداری پر قائم رہے۔ بڑی محبت سے ملتے تھے اور مل کر خوش ہوتے۔ آخری بار ان سے ملا تو پردہ کروا کے اندر گھر میں بیوا لیا۔ ایک جھلنگے میں لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ ان کے صاحب زادے ناصر خلیق شکار بہت پریشان تھے۔ فراق صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے۔ "لو مہی شاد میاں، چلنے کا وقت آ پہنچا ہے"

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تک بس چل سکے ساعہ چلے

بھٹی نئے، ہمارے مرنے کی خبر ان کو ضرور دیتا۔ "میرا دل بھر آیا۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ ان سے مصافحہ کر کے باہر چلا آیا۔ وگاہ صاحب نے بتایا کہ "ابا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی دُوم کے مہمان ہیں۔"

تیسرے دن ان کی سناؤنی سنی۔ خواجہ میر درد کی یادگار ختم ہوئی۔ اردوئے معلیٰ کا کوئی لکھنے والا نہ رہا شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ اُستاد کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کی نام تمام تصنیف "ڈرامہ اکبر" کی تکمیل فراق صاحب ہی نے کی تھی افسوس کہ زمانے نے انہیں اتنی فرصت نہ دی تھی کہ کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑتے عرصہ ہوا

سر عبد القادر کی فرمائش پر ایک ناول "المورکھا" لکھنا شروع کیا تھا۔ مخرن بند ہوا تو ان کی بہمت بھی پست ہو گئی۔ پھر اور لوگوں کے اصرار پر اسے مکمل بھی کر لیا تھا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ نہ جانے اس مسودے کا کیا حشر ہوا۔

نواب سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی لوہارو کی نوابی کے اصل وارث تھے مگر انگریزوں نے ان کے والد کو گدی سے لائق کر کے ان کے چچا کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کے والد پر الترام لگایا گیا تھا کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ نواب سائل پہلے لال دروازے میں رہتے تھے، پھر فرانسس خانہ میں اٹھ آئے تھے، سب سے پہلے ہم نے انہیں اپنے بچپن میں ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ عجب شان و شوکت کے بزرگ تھے۔ میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید براق ڈارھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوڑی زرد کارلیس کی خملی ٹوپی۔ قریب سے دیکھو تو اس پر زردوزی میں سائل دہلوی لکھا ہوا۔ چست سجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک پٹری ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی۔ یا میں ہاتھ میں چاندی کی مٹھ کی چھتری، دائیں ہاتھ میں چھ انچ لمبا گار۔ مخصوص ترنم سے غزل پڑھتے اور سننے والوں کو پھڑکاتے۔ پھر نواب صاحب کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مستاعروں میں، پارٹیوں میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں، اور عجب میرے والد کو آخری عمر میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو انھوں نے نواب سائل کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اکثر میرے والد ان کے ہاں جاتے اور کبھی کبھی نواب صاحب بھی ہمارے ہاں آتے۔ کلام دکھانے کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ شاگرد نے دس دس پندرہ پندرہ غزلیں (دآغ کے رنگ ہیں اور زین ہیں بھی) روزانہ کہنی شروع کر دیں۔ نواب صاحب کوئی ترمیم کرتے تو شاگرد صاحب، ان سے اُلجھ جاتے اور ان کی اصلاح کو نہ مانتے۔ لہذا استاد شاگردی زیادہ دن نہ چل سکی، دوستی البتہ قائم رہی۔

نواب سائل بڑے حلیم الطبع اور بردبار آدمی تھے۔ دلی کے معززین میں شمار ہوتے اور انگریزوں میں بھی ان کی خاصی پوچھ تھی۔ ان کا کلام خود ان کی شہرت کو چار چاند لگانا تھا مگر ان کی بعض باتیں بالکل بچکانہ ہوتی تھیں۔ مثلاً ٹوپی پر نام لکھوانا یا کسی نہ کسی بہانے یہ جتنا کہ "یہ

داغ کا داماد ہوں۔" اُن کی یہ کمزوری اُن کے اکثر منقطعوں میں بھی ظاہر ہوتی، مثلاً:

جنابِ داغ کے داماد ہیں ہم دلی دالے ہیں

یا وہ منقطع جس پر لکھنؤ والوں نے بہت اعتراض کیا تھا:

انگلیاں اٹھنے لگیں داغ کے داماد اُٹے

ایک دفعہ میں اُن سے ساتی کے لیے غزل لینے اُن کے گھر گیا۔ اور بھی کئی احباب اور شاگرد

جمع تھے۔ سائل صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی۔ ہر شعر پر واہ وا ہوتی رہی اور وہ یہی فرماتے

رہے "میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہلوار ہی ہے جو گھر میں بیٹھی ہے۔" داغ کی بیٹی کہلوار ہی ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو بیگم سے اور انھی کی وجہ سے استاد سے بے حد محبت تھی۔

ورنہ بیگم صاحبہ داغ کی حقیقی بیٹی نہیں سمجھیں بلکہ اُن کی سالی کی صاحب زادی تھیں، داغ نے

انھیں گود لے لیا تھا۔ اسی طرح اُن کا ایک مصرع تھا:

غالب میرے دادا تھے میں غالب کا پوتا ہوں

حالاں کہ نہیں تھے۔

اردو فارسی میں اُن کی قابلیت مسلم تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے۔ چھوٹے

بڑے سب سے اچھی طرح سے پیش آتے تھے اس لیے اکثر طالب علم انھیں گھیرے رہتے تھے۔

ایک دن اس شعر پر دوستوں میں بحث چل نکلی۔

خواہیم از خُدا سخا، ہم از خُدا

دیدن رُخِ حبیب و نہ دیدن رُخِ رقیب

لف و نشر مرتب کے اعتبار سے اس شعر کی صورت یوں بنتی ہے کہ:

خواہیم از خُدا دیدن رُخِ حبیب

سخا، ہم از خُدا دیدن رُخِ رقیب

لہذا شعر بے معنی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ مسکہ سائل صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلے تو وہ بھی

چکرائے مگر غور کرتے کے بعد بولے: "کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ رقیب کے بدلے حبیب

ہونا چاہیے۔"

نوابوں میں عام طور سے اتنے شریف طبیعت کے لوگ نہیں ہوتے جتنے کہ نواب
سائل۔ ان کے بڑے بھائی نواب نایاب ان کی ضد تھے۔ گالیاں دینے پر آتے تو شیطان بھی کانوں پر
ہاتھ دھرتا۔ اکثر سائل صاحب پر پرس پڑتے اور وہ مغلفات سُناتے کہ الہی توبہ۔ مگر وہ بچا سے
مٹھ سے اُن تک نہ کمرتے۔ دبی زبان سے اتنا البتہ کہہ دیتے کہ ”بھائی جان، گالیاں آدھی مجھ پر
پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر“۔ اسی طرح حبیب بیخود صاحب مشاعروں میں بوسم ہو کر مادر چادر
پر اُتر آتے تو سائل صاحب جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ دلی میں بیخود والوں اور سائل والوں
کے بڑے بڑے پالے ہوتے۔ اکثر مشاعروں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی۔ سائل صاحب ان
جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے۔ اور بالآخر انہوں نے دلی کے مشاعروں میں شریک ہونا ہی چھوڑ
دیا تھا۔ بیخود اور سائل کے اختلاف کی اصل وجہ داغ کی جانشینی تھی جس کے مدعی دونوں تھے۔
آخری سمر میں سائل صاحب کی ران کی بڑھی ٹوٹ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور رہو
گئے تھے۔ ایک رکشا رکھ لی تھی۔ اس میں ان کا سوار ہونا اور اس میں سے اُترنا ہی ایک بڑا مرحلہ
ہوتا تھا۔ ایک دن اس رکشا کا پہیہ لال کنویں پر ٹیریم کی لیکھ میں ایسا اڑا کہ رکشا اُلٹ گئی۔ سائل
صاحب کے سر میں سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے دوڑ کر انہیں اٹھایا۔ ہائے ہائے کرتے تھے اور
اپنی بے بسی پر روتے تھے۔ میں بھی پیش احوال کو گیا۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے: ”ایک وقت
وہ تھا کہ حبیب ابا جان کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپک کر اُس کی دم پکڑا اور جا بیٹھتا۔ اب یہ حال
ہے کہ دوسروں کے سہارے کے بغیر اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا“
سائل صاحب نے ہزاروں غزلیں کہیں۔ ان کے دیوان بھی چھپے مگر ان کا عمر بصر کا حاصل
نظروں سے پوشیدہ ہی رہا۔ نور جہاں اور جہاں گیر کے عشق پر ایک مثنوی لکھ رہے تھے جس کے
۵ ہزار شعر کہہ چکے تھے۔ افسوس کہ یہ خزانہ دہیندہ بن کر رہ گیا۔

مولوی احتشام الدین

مولوی احتشام الدین صاحب دلی کے حقیقی خاندان کے سپوت تھے۔ علی گڑھ کے پُرانے
گریجویٹ۔ عرصے تک وہیں لائبریرین رہے۔ کتابیں پڑھتے کیا تھے، نکلتے تھے۔ انہوں نے سارا

اُردو ادب چاٹ رکھا تھا۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ طلسم ہوش رُبا اور بوستان خیال جیسی ضخیم کتابیں انہیں از بر تھیں۔ انہیں یہ تک یاد تھا کہ کون سا لفظ کس کتاب میں کس صفحے پر آیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جب اُردو کی بڑی لغت کوئی تیس بتیس جلدوں میں مرتب کرنی شروع کی تو بڑے بڑے جتاد رہی بطور مددگار رکھے، مگر سب کے سب دے تے تہا کر بھاگ گئے۔ بالآخر احتشام الدین صاحب اُن کے ہتھے چڑھے۔ حیدرآباد دکن میں ان کا کمرہ دیکھنے کی چیز تھا۔ سیکڑوں نئے نئے خانوں کی الماریاں دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب بیچ میں بیٹھے پڑھوں پر الفاظ لکھتے اور ان خانوں میں ڈالتے رہتے۔ مولوی صاحب کے کام کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب تک جاگتے رہتے یہی کام کرتے رہتے۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی لکھتے اور سند کے لیے کسی مستند کتاب کا حوالہ بھی دیتے۔ جب انجمن دلی آگئی تو مولوی صاحب نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں یہی دھندا پھیلایا۔ انہیں اپنے کام میں اتنا اہتمام ہوتا تھا کہ کھانے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ اُن کی بیگم صاحبہ اکثر یاد دہانی کرا لیتیں اور اکثر تودا کر کہتیں، تب کہیں کھانا کھانے اُٹھتے۔ مہمد اور بتیالی پہنے، پسینے میں شرابور، کتابوں اور پڑھیوں کے ڈھیر میں دیے رہتے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کام کے لیے انجمن کو حیدرآباد سے جو امداد ملتی تھی، وہ بند ہو گئی تو مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے کہا کہ کام روک دیا جائے۔ مگر مولوی صاحب اسی دن وہی سے کام کرتے رہے۔ لغت ختم پر آ رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلدی ختم ہو تو اس کی چھپائی کا کام شروع ہو۔ کم و بیش بیس سال کی محنت تھی بلکہ عمر مہیر کی جانفشانی کا حاصل۔ مولوی عبدالحق صاحب کے ہاں سے تنخواہ آتی بند ہو گئی مگر مولوی صاحب کا کام بند نہ ہوا۔ انہیں اپنے کام سے محبت ہو گئی تھی، جنون ہو گیا تھا۔ بڑھاپا۔ غذا کم محنت زیادہ۔ صحت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ دوستوں اور گھروالوں نے بہت سمجھایا کہ کام چھوڑیے اور آرام کیجیے۔ مگر مولوی صاحب کہتے کہ اگر یہ کام نہ کروں تو پھر کیا کروں؟ غرض تنخواہ نہ ملتی تھی، نہ ملی۔ مولوی صاحب اسی طرح کام کرتے رہے۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ذمہ دست کار نامہ دیوان حافظ کا

منتظوم ترجمہ تھا۔ مولوی صاحب نے ترجمہ بقید بحر کیا تھا۔ افسوس کہ یہ کاوشیں دہنی زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوئی۔

مولوی احتشام الدین جیسا محقق الفاطم نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ ہمیں بھی اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا مگر مولوی صاحب کے سامنے ہماری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی رہ جاتی۔ مثلاً مولوی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا۔ ”یہ اردو زبان بھی عجیب زبان ہے۔ فقرے کے لحاظ سے ایک لفظ کسی کسی معنی تو دیتا ہی ہے مگر ”اچھا“ بد معنی بُرا اور ”بُرا“ بد معنی ”اچھا“ کسی اور زبان میں کبھی سنا؟“ اور زبان کا تو ذکر ہی کیا؟ ہم نے تو اردو میں بھی ان الفاظ کے کبھی ان معنوں میں استعمال ہونے پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو مولوی صاحب نے بتایا تو معلوم ہوا کہ ہم روزانہ ان دونوں لفظوں کو متضاد معنی میں بولتے ہیں، مگر لفظوں کے اس نازک پہلو کو دیکھنے کی آج تک توفیق نہ ہوئی۔ اس قسم کے سیکڑوں لفظ مولوی صاحب کو یاد تھے اور لغت میں تو خرما جانے، الفاظ کے کتنے تزیانے تھے۔

ایک دن سنا کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ میں خیریت معلوم کرنے گیا۔ دیکھا لیٹے لیٹے پرچیاں اُلٹ رہے ہیں۔ کئی دن سے بخار تھا، اُس وقت بھی پنڈا پھنک رہا تھا۔ ان کے صاحب زادے میاں ثناء الحقی بہت پریشان تھے۔ انھیں تسلی دے کر چلا آیا۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ مولوی صاحب اردن ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ ہسپتال جا کر ان سے ملا تو بہت سخیف آواز میں شکر یہ ادا کیا۔ چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ یوں اب کے اچھے ہونے کے بعد سستی کے لیے ایک سلسلہ مرضا میں لکھوں گا۔“ مگر دوسرے دن سنا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ض

لے بسا آرزو کہ خاکِ شد

مرزا چپاتی

مرزا فخر الدین نام، فخر تخلص، عرف مرزا چپاتی۔ دہلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

گورا رنگ، کشادہ پیشانی، غنائی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، گول سفید داڑھی، کسرتی

بدن، سر و قد، بر میں سفید انگر کھاء، آڑا پا جامہ، سر پر چوگوشہ، پاؤں میں سلیمے کی بونی۔ واقعی مغل
شہزادہ دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے میں عسرت نے گھیر لیا تھا۔ سر پر چوڑی لیس کی ٹوپی، گھٹے میں
پیشا ہوا مسلم کا کرتا، پاؤں میں لیترے ہلکے پھرتے تھے۔ مگر مرزا کی خوش مزاجی میں آخر تک
فرق نہ آیا۔

جب تک پیسہ رہا خوب اللے تلے سے گزر کی۔ شاید ہی کوئی بازی ان سے چھوٹی ہو۔ کیونکہ
لال اور پڈیاں اڑاتے تو اوروں کو بھی دیکھا لیکن طوطے اڑاتے مرزا چپاتی ہی کو دیکھا۔ پتنگ بنانے
اور پیچ لڑانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ آخر آخر میں پیرم خاں کے تراہے کے قریب ایک بوسیدہ سی
دکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ پتنگیں بناتے اور پیٹ پالتے۔

غضب کے توتلے تھے۔ "ت" "کو" "ٹ" بولتے۔ زندہ دل اور فقرے باز تھے۔ سیر سپاٹے
کے دل دادہ۔ ذرا رت بدلی اور انہیں دُور کی سوجھی رہسات کا چھینٹا پڑا اور انہوں نے قطب
کی راہ لی۔ کسی کھنڈر کے ایک در میں مرزا بھی اپنی گڈیاں لگا کر بیٹھ جاتے۔ کانپ ٹھڈے چاقو
سے پھیلتے رہتے اور انہیں جھکا جھکا کر دیکھتے رہتے۔ دمر چل، دھیل چل، پٹیل، پرمی، بھیریا،
مل دُما، بھل دُما، بیسیوں قسم کی گڈیاں ان کے پاس تیار رہتیں۔ برکھارت ساری قطب ہی میں گزارتے۔
مرزا کی وجہ تسمیہ بھی عجیب ہے۔ مرزا بڑے چاڈ اور امانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔
ان کی اماں نے منت مانی تھی کہ جب میرا بچہ بڑا ہوگا تو قطب صاحب کی درگاہ پر اس کے
ہاتھ سے حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی۔ بارہویں برس ان کی منت بڑھائی گئی تو مرزا نے چپاتیاں
بانٹنی شروع کیں۔ لینے والے "مرزا چپاتی" "مرزا چپاتی" کہہ کہہ کر چپاتیاں مانگتے تھے۔ اسی دن سے
مرزا کا نام مرزا چپاتی مشہور ہو گیا۔

مرزا صاحب اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے بہر دل عزیز تھے۔ اپنے خاندانی وقار کی وجہ
سے اُمر میں بلائے جاتے تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے اس لیے مشاعروں میں بلاؤ ہوتی۔ تنگ
پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے۔ ان کے اکثر اشعار دلی والوں کو ازبر ہو گئے تھے۔ اس ایک
شعر پر مرزا نے مشاعرہ اڑا کر رکھ دیا ہے

بنالی شوٹ میں شادا نے پر یہ نہیں سمجھا
نہیں جنت لے بائی ہوں نہ جنت میرا بل ہے

ایک مسالمہ میں اُن کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ہے
 شہ نے عاید سے کہا بدلہ نہ لینا شہر سے
 سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

اُن کے تین شعر اور یاد آگئے ہیں

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زرہ کو
 ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو
 دلِ دل کے ہیں پونیس عدد صرف بھی دو ہی
 بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہسم زبرد و زبرد کو
 ان چاروں کو جادوئے ستم دیکھا ہے فخر و
 اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنسر کو
 دہلی کی دو ڈیرہ دارطوائفیں اب سے کوئی چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں۔ نام تو خبر نہیں
 ان کے کیا تھے، دو تھی اور چوتھی کہلاتی تھیں۔ دہلی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی
 ہوئی۔ اس میں دو تھی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا، اور دو تھی جان فرماؤں گانے سنا چکیں تو انھوں
 نے اپنی پسند کے گانے سنانے شروع کئے۔ مرزا چپاتی نے کہا۔ ”بانی جی ذرا مٹھنا۔ ایک شعر ہو گیا
 ہے، پہلے وہ سن لو۔“ مجلس میں سنا ہوا گیا۔ مرزا نے شعر پڑھا ہے

ڈھستے ڈھستے ہو ڈھٹی اٹنی ملت
 ساٹ پیسے ٹی ڈو تھی رہ ڈٹی
 (گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملت
 سات پیسے کی دو تھی رہ گئی)

محفل میں ایک قہقہہ بڑا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دو تھی جان بڑی لقلقے کی خاتون تھیں۔
 اُن کی تیوری پر ہلکا سا بل آیا، مگر انھوں نے مجلس میں کھنڈت نہ ڈالنی چاہی۔ خود بھی ہنسنے لگیں۔
 اور بولیں۔ ”سبحان اللہ مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل سُت گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری سی
 جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا اس لیے حاضر ہو گئی۔“ صاحب خانہ نے کہا
 ”بانی جی، تم تو جانتی ہی ہو مرزا کی عادت شوخی کی ہے۔ ہاں، آپ سنائے کیا سنا رہی تھیں؟“
 اور گانا پھر شروع ہو گیا۔

مرزا بڑے لاڈ پیار میں پلے اس لیے کورے جاہل رہے مگر ان کی گفتگو سے جہالت ظاہر
 نہ ہوتی تھی۔ لمبی عمر پائی۔ آخری وقت اچھا نہ گزرا۔ غسرت و تنگ دستی میں مرے۔

نواب تاباں

نواب تاباں نواب سائل کے بڑے بھائی تھے۔ بالکل انھی کی طرح میدہ و شہاب رنگ، ویسا ہی ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس۔ مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانتے کیا کہتے تھے کہ ہمیشہ بڑا بھلا ہی کہتے رہتے تھے۔ بلکہ گالیاں تک دینے سے نہ چوکتے تھے۔ اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائل بے چارے سر جھکا کر کہتے۔ ”بھائی جان، ادھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور ادھی آپ پر۔“ اس پر وہ اور بگڑتے اور ایسی سناتے جو دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ مگر کیا مجال جو سائل صاحب کی پیشانی پر پیل آجائے۔ وہ ان کی بڑگی کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اپنی آواز میں ان کے سامنے بولتے بھی نہیں تھے۔ نواب تاباں بھی شاعر تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ حکیم اجل خاں کے ہاں شرفائے دہلی کا جگمگا رہتا تھا۔ حکیم صاحب بھی عجیب خوبوں کے آدمی تھے۔ یہ جتنے بڑے طبیب تھے اتنے ہی بڑے لیڈر اور اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ ایک دفعہ شبلی نعمانی دلی آئے تو حکیم صاحب کے ہاں ہمان ہوئے۔ نواب تاباں کی تعریف غالبانہ بہت سن چکے تھے، ان سے ملنے کے خواہش مند ہوئے حکیم صاحب نے سوچا کہ نواب کو اگر یہاں بلایا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات کا بُرا مان جائیں۔ اس لیے ایک صاحب کے ساتھ شبلی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ نواب صاحب تے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت سے بٹھایا۔ خاطر تواضع کی شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل سنانی شروع کی۔ شبلی بھی ذرا مدہم آدمی تھے، خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ تاباں نے دیکھا کہ مولانا ہوں ہاں بھی نہیں کرتے تو چمک کر بولے۔ ”ہاں صاحب، یہ شعر غور طلب ہے“ اور غزل کا اگلا شعر سنایا۔ مولانا نے فرمایا ”سبحان اللہ، خوب شعر کہا ہے آپ نے“۔ ”یس پھر تاباں آئیں تو جائیں کہاں؟ بگڑ کر بولے“ اے لنگڑے، میں نے تو یہ شعر تین دن میں کہا اور تو نے اسے ایک منٹ میں سمجھ لیا بیٹا۔ یہ شعر العجم نباشد۔“ اس کے بعد ان کی گالیوں کا پتارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ویسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں نواب تاباں بڑے زندہ دل اور دوستوں کو کھلا پلا کر خوش ہونے والے آدمی تھے۔

مُلاَ وَاَحَدِی

کو پڑھ چیلان میں، جہاں میر جالب کا مکان تھا، ذرا اور آگے بڑھ کے مُلا وَاَحَدِی کا مکان تھا۔ وَاَحَدِی صاحب کی طرح اُن کا مکان بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ ادب، مذہب، صحافت اور سیاست کی اکثر ہستیوں نے اسی مکان میں فریغ پایا۔ یہاں سے متعدد رسالے جاری ہوئے۔ وَاَحَدِی صاحب عمر بھر بڑے خاموش اور مخلص کارکن رہے۔ نام و نمود کی اُمخوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست رہے۔ دلی میں اُن کی بہت جا نداد تھی۔ خدمت کے جنون نے انہیں کھک کر دیا۔ آخر میں بس یہی مکان رہ گیا تھا۔ جس میں ۱۹۴۷ء تک رہے۔ دلی سے انہیں عشق تھا کہیں باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ شملے گئے، تو ایک گاڑی سے گئے اور دوسری سے لوٹ آئے۔ وَاَحَدِی صاحب بڑے محنتی اور اُصولی آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کام کیا۔ بیسیوں ایڈیٹروں اور سیکڑوں ادیب پیدا کیے۔ خواجہ حسن نظامی اپنی ابتدائی زندگی میں وَاَحَدِی صاحب ہی کے رہن منت رہے۔ خواجہ صاحب نے بھی آخر تک حق دوستی نبھایا۔ علامہ راشد الخیری سے ”شامِ زندگی“ وَاَحَدِی صاحب ہی نے لکھوائی۔ علامہ آزاد مزاج آدمی تھے۔ دنوں قلم ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ لوگ خوشامدیں کرتے، معاوضے پیشگی دے جاتے مگر وہ توجہ نہ کرتے۔ وَاَحَدِی صاحب نے خبر نہیں کیا منتر پڑھا کہ علامہ کو سولہ آنے اپنے قبضے میں کر لیا۔ روزانہ انہیں ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتے اور جیب مقررہ صفحوں کی تعداد پوری ہو جاتی تو انہیں کھول دیتے۔ یوں یہ پوری کتاب لکھوائی گئی۔ خواجہ صاحب دلی سے تین میل دُور بستی نظام الدین میں رہتے تھے مگر روزانہ وَاَحَدِی صاحب کے ہاں آتے اور انہی کے ہاں تصنیف و تالیف کا کام کرتے۔ خواجہ صاحب کے ایک اور مخلص دیرینہ بھتیجا احسان تھے۔ جو تھے تو میرٹھ کے رئیسوں میں سے مگر رہتے دلی میں تھے۔ وَاَحَدِی صاحب کی طرح یہ بھی وضع دار اور دل والے تھے۔ انہیں کچھسکا اور ادب کا روگ اُمخیں بھی ساری عمر رہا۔

پنڈت امر ناتھ ساہو

پنڈت امر ناتھ ساہو دہلی کے لائق فخر لوگوں میں سے تھے۔ عمر ستر اسی کے درمیان۔ اوسچا پورا
 قد، بہت لمبی چوڑی نما دارھی۔ ریٹائرڈ تحصیل دار تھے۔ میر ناصر علی کی طرح ان کی پنشن پانے کی مدت
 بھی علامہ کی مدت سے زیادہ ہو چکی تھی۔ شاعری کے عاشق اور استاد تھے۔ شعر اردو میں بھی کہتے
 تھے اور فارسی میں بھی، مگر اتنے گہرے روحانی اور ادق عرفانی مضامین باندھتے کہ سامعین کے پے
 کچھ نہ پڑتا۔ پنڈت جی دہلی کے پورانے وضع دار ہندوؤں کا آخری نمونہ تھے۔ ان کی عبا قبا، جعبہ و دستار
 دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہوتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ دہلی کے ہندو
 مسلمانوں کے لباس اور بول چال میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ پنڈت جی کی اردو بھی چغلی نہیں
 کھاتی تھی یہی کیفیت ہم نے پنڈت جی کی تریہ کیفی اور ترجموں نامہ نذر کی بھی دیکھی۔ پنڈت جی
 بہت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک دفعہ چند لڑکے رات کے گیارہ بجے ان کے گھر پہنچ
 گئے۔ چوڑی دالاں سے جو راستہ سینتارام کے بازار کو جاتا ہے اُس کے سرے پر ان کا بالاخانہ
 تھا۔ کندھی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالیٹن لیے زینے پر سے اُترے۔ پوچھا۔ "کیسے رحمت فرمائی؟"
 لڑکوں نے کہا۔ "ہمیں آپ کا کلام سننے کا بہت اشتیاق ہے۔ صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے۔"
 پنڈت جی نے فرمایا۔ "کیا مضائقہ ہے۔ اور خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔
 کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا۔ جل پان پیش کیا اور اپنا کلام سنا کر انہیں رخصت کرنے نیچے تک
 آئے۔ اسکول اور کالج کے لڑکے جب چاہتے پنڈت جی کو مشاعرے کی صدارت کے لیے لے جاتے۔
 بعض بد تہذیب لڑکے پنڈت جی سے بد تہذیبی کمر جاتے تو پنڈت جی ناراض ہو جاتے مگر پھر فوراً
 من بھی جاتے۔ کالج کے مشاعرے میں ایک صاحب زادے نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے
 یہ شعر پڑھا۔

یہ کہتا بیٹا جا کر اپنی ماں سے

کہ تم رُوٹھی ہو کیوں آبا میاں سے

پنڈت جی کی آنکھیں ابل پڑیں۔ بولے "کیا مضائقہ ہے صاحب زادے تمہارے باپ سے شکایت

کر دوں گا۔“ دوسرے لڑکوں نے کہا۔ ”پنڈت جی اس گستاخ کو معاف کر دیجیے۔ ہاتھ جوڑ رہا ہے۔“
 پنڈت جی مسکرا دیے اور بولے۔ ”ادھر لاؤ اسے میں اس کے کان کھینچوں گا۔“ محبت سے کان کھینچ کر بولے۔
 ”کیا مفنا لفظ ہے۔ یا ادب بانصیب۔ بے ادب بے نصیب۔ جاؤ۔“ پنڈت جی خود بھی سالانہ مشاعرہ کمنے
 اور دُور دُور سے شعر آکر اس میں شرکت کرتے۔ پنڈت جی ان کے قیام و طعام کا انتظام کرتے۔ دلی میں
 اُس مشاعرے کی دُھوم مچ جاتی۔ ان کے بعد اس شان کے مشاعرے دلی میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

خلیقی دہلوی

اب سے چالیس پچاس سال پہلے ”ادب لطیف“ کی تحریک طاعون کی طرح پھیلی۔ اس
 کی محرک بڑی حد تک ٹیگور کی گیتا بنجی تھی۔ اُس دور کے ادیبوں کو ایک نئی چیز ہاتھ آئی کہ ایسے
 بھی چھوٹے چھوٹے خیالی مضامین لکھے جا سکتے ہیں جن میں خوب صورت فقرے اور اچھوتی ترکیبیں
 ہوں۔ چاہے مطلب کچھ بھی نہ نکلتا ہو۔ نیاز فتح پوری نے گیتا بنجی کا ترجمہ عرضِ نغمہ کے نام سے کر دیا۔
 اور انگریزی سے ناواقف ادیبوں نے اسی انداز پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بعض اچھے ادیب بھی
 اسی رنگ میں رنگے گئے۔ یلدرم، نیاز، دلگیر، مہدی افادی، ل احمد اور خلیقی دہلوی نے
 خوب خوب قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ اس جہت کے پہلے سرغنہ شاہ دلگیر اکبر آبادی تھے۔ نقاد
 کے ایڈیٹر اور ان کے بعد دوسرے ایڈیٹر نیاز فتح پوری، نگار کے ایڈیٹر۔ اس ٹولی میں بیان کے
 ساتھ ساتھ خیال کے بانگین کا جس نے سب سے زیادہ خیال رکھا وہ ایک صاحب تھے محمد دین
 خلیقی دہلوی۔ تھے تو تجارت پیشہ آدمی، مگر ادب کا بڑا مستحضر مذاق رکھتے تھے۔ کوئی اچھوتی ترکیب
 سمجھ میں آجاتی تو گھنٹوں اس کا لطف لیتے۔ لکھتے بہت کم تھے اور مختصر۔ مگر جو کچھ لکھتے یہ معلوم
 ہوتا کہ تنگینے جہڑ دیے ہیں۔ حافطہ اچھا پایا تھا۔ انہیں اپنے یہ نثر پارے لفظ بہ لفظ یاد رہتے تھے۔
 جس طرح شاعر اپنی غزل یا نظم سناتا ہے یہ اپنی نثر سناتے تھے۔ ان کے اکثر فقرے آج تک
 کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کچھ اس طرح کے ہوتے تھے :

”ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ چشمے کا پانی شراب بن گیا ہے۔ شراب اس لیے بن گیا
 ہے کہ صبح کے وقت قد آدم نساٹی آئیے اس میں معتدل کیے جاتے تھے“ (یعنی عورتیں اس میں نہایا

کرتی تھیں) خلیقی صاحب اپنے نثر پاروں کی داد پاتے تو ازراہ انکساری فرماتے ”ننگِ قلم ہوں“
 بانیں کرنے میں بھی اکثر مغلوق الفاظ بولتے تھے۔ یہ عادت انھیں غالباً مولانا عبدالسلام صاحب کی
 صحبت میں پڑی تھی، جن کی عالمانہ خوش گفتاری دلی میں مشہور تھی۔ خلیقی صاحب نے زیادہ عمر نہیں
 پائی۔ انھیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرض لا علاج ہے۔ خاصے بھاری
 مہر کم آدمی تھے۔ بیماری میں کھکتے چلے گئے۔ فرماتے تھے کہ ”مجھے اس کی خوشی ہے کہ دل کی
 بیماری سے مر رہا ہوں“

مرزا حیرت دہلوی

دریے میں پائے والوں کی طرف سے داخل ہو کر چند قدم چلنے کے بعد ایک تین در
 کی دکان بائیں ہاتھ کو آتی ہے۔ اس کے تھڑے کی طرف گاؤں تکبیر سے لگے ایک بزرگ بیٹھے رہتے
 تھے۔ گورا رنگ، سفید براق سر، سیدی ڈاڑھا، غلانی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں،
 لبوں پر پان کی سُرخی۔ یہ مرزا حیرت دہلوی تھے۔ بہت بڑے عالم تھے مگر ان کا دماغ صرف بُرائی
 سوچتا تھا۔ دلی میں چھاپے کی مشین سب سے پہلے انہوں نے ہی لگائی تھی اور کمزور گزٹ جاری
 کیا تھا۔ اس اخبار میں جس کی چاہتے خبر لیتے جس کی چاہتے ٹوپی اتار لیتے۔ شورش پسند آدمی تھے،
 طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے رہتے تھے۔ واقعہ کہ بلا ہی سے انکار کر دیا اور حساب لگا کر بتایا تھا
 کہ جس زمانے میں اس کا وقوع بتایا جاتا ہے، گرمی کا موسم نہیں تھا بلکہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔
 مولانا حالی نے مسدس مدد و جزیر اسلام لکھی تو دونوں اس کی تردید و تضحیک میں مضامین لکھتے
 رہے۔ حالی فرماتے ہیں

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

مرزا حیرت نے اس پر فرمایا

ذرا دیکھیے تو یہ کیا کہہ رہے ہیں

عرب کو جزیرہ نما کہہ رہے ہیں

ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع ہوا تو اس کے فوراً بعد ہی مرزا حیرت کا ترجمہ قرآن شائع ہو گیا۔

اور ساٹھ بھی رکھا تو گز بھر کا۔ شبلی نعمانی کے ساتھ حیدر آباد دکن گئے۔ سالار جنگ کی خدمت میں دونوں پہنچے۔ شبلی نے مرزا کی تعریف کر کے تعارف کرایا۔ سالار جنگ نے مرزا سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ مرزا نے شبلی کی تازہ نظم سنانی شروع کر دی۔ شبلی نے ہنوکا دیا لوہنگی لے کر انہیں خاموش کر دیا۔ سالار جنگ نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔

بازرگن کر شبلی نے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟" یوں۔ "تم سنانے تو تمہیں ایک پھوٹی کوری بھی نہ ملتی، مجھے ہزار روپے تو مل گئے۔"

جب مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی چلی تو مرزا حیرت محمد علی کے طرف داروں میں ہو گئے اور "دردِ عمر" میں خواجہ صاحب کے خلاف لکھتے رہے۔ ایک دن مرزا حیرت اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بد معاش نے کسی بات پر مھنگڑا کر کے ان پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ لوگوں نے بچ بچاؤ کیا مگر اس کم بخت نے ایک جوتا ایسا کھینچ کر مارا کہ مرزا کے منہ پر لگا۔ اس دن کے بعد مرزا نے دکان پر سامنے کے رخ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ مرزا حیرت کے انتقال کے بعد ان کا نایاب اور قیمتی کتب خانہ لال کنویں پر ایک کباڑیے کے ہاں برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

دلی کی یاد آئی تو دلی کی وضع دار ہستیوں کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان کا تذکرہ رُلف یار کی طرح دراز ہی ہونا پلا جاتا ہے۔ یا اسے شبِ فراق کی درازتی سے مشابہ سمجھیے۔ آنکھیں اب ان صورتوں کو ڈھونڈتی ہیں اور ماضی کے دُھندلے میں نظریں بسٹک کر بالوں لوٹ آتی ہیں۔

وے صورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں

اب دیکھتے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

مہال سیوہاروی

ایک دن ایک صاحب ملنے آئے۔ ڈیلے پیلے، سانولا رنگ، عمر تیس سال، ڈاڑھی موندھی صاف، چہرے پر ناک ذرا ضرورت سے زیادہ نمایاں، شیروانی اور علی گڑھ فیشن کا پاجامہ مسکراتے لجاتے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مہال سیوہاروی ہیں۔ ان کا کلام کبھی پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کسی سے ان کا نام ہی

سنا تھا۔ ساتی کے لیے اپنا کلام مجھے دیا۔ میں نے پڑھا، پھر انہیں غور سے دیکھا۔ بڑا جان دار
 شعر کہتے تھے۔ میں نے کہا۔ "شائع ہو جائے گا۔" وہ مسکرا کر چلے گئے۔ ساتی شائع ہوا تو پھر
 آئے۔ پوچھا اور کچھ کلام دے گئے۔ پھر انہیں سائل صاحب کے ہاں دیکھا اور مشاعروں
 میں پڑھتے ہوئے بھی سنا۔ بہت بڑا پڑھتے تھے۔ تخریب، اللفظ پڑھتے تھے مگر کچھ اس طرح
 ہونٹ چبا کر اور جھلا کر کہ دیکھ کر ہنسی آئے۔ و فوہ بوشس سے منہ سے تھوک بھی اُٹنے لگتا
 تھا۔ پھر خدا جانے کس کے مشورے سے ترقم سے پڑھنے لگے۔ اور بھی مٹی پلید ہو گئی۔
 اس عرصے میں نہال سے خاصا تعلق خاطر ہو گیا تھا اور کھل کر ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ ترقی
 پسند تو اب پیدا ہوئے ہیں، نہال ہمیشہ سے ترقی پسند تھا۔ اس کے اشعار میں جوانی کی نازک
 محنتی۔ وہ جوش و خروش کا شاعر تھا۔ غزل بھی کہتا تو روایتی بے ہودگی اور نامردی سے
 پاک۔ نظم میں سوائے جوش ملیح آبادی کے اور کسی کا کلام اُس کے آگے نہیں ٹھہرتا تھا۔
 جوش صاحب جب دلی آکر رہے اور انہوں نے کلیم جاری کیا تو دلی کے ادبی حلقے میں جان
 پڑ گئی۔ جوش نہال کے بے حد مداح تھے جس دن نہال ان کے ہاں نہ جاتے، جوش شام کو
 نہال کے گھر پہنچ جاتے اور انہیں وہاں سے لاتے۔ کتب خانہ علم و ادب شہر کے منہج میں
 ہونے کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بن گیا تھا۔ شام کو سب اپنے اپنے کاموں
 سے فارغ ہو کر کتب خانے پہنچ جاتے۔ مرزا ہیم بیگ چغتائی کے لطیفے ہوتے۔ نہال
 اور تالش کی غزلیں ہوتیں۔ ظفر قریشی، صادق الجیری، فضل حق قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین
 اور سبیب اشعر روز کے آنے والوں میں تھے۔ ان میں ادبی گفتگو ہوتی، نوک جھونک
 ہوتی۔ کسی ایک کو نقل محفل بنا لیا جاتا۔ خوب ہنسی ہوتی۔ چائے پی جاتی، جی چاہا تو کچھ کھایا
 بھی جاتا۔ اور دو گھنٹے بعد یہ اجتماع ختم ہو جاتا۔ نہال بڑا مرتجاں مرچ انسان تھا۔ مزاج
 میں کچھ سُن پرستی بھی تھی اس لیے اکثر نزلہ اسی غریب پر گرتا تھا۔ مگر وہ اللہ کا بندہ ہنسنا
 ہی رہتا۔ ایک دن اپنے سے بھی مٹھی مہیرا اونچا نو جوان ساتھ لیے ہوئے آئے۔ ہم سمجھے کہ
 کوئی دوست ہوگا۔ نہال کے ساتھ اس پر بھی دو چار فقرے ہوئے۔ نہال بہت سٹ پٹا
 اور خلاف معمول بلدی چلے گئے۔ اگلے دن آئے تو اخلاق احمد نے خبر لی۔ نہال نے بڑی

عاجزی سے کہا۔ "میرا بڑا لڑکا تھا۔ میں نے سوچا تم کچھ اور نہ کہہ بیٹھو۔ اس لیے جلدی چلا گیا۔" نہال بڑے صبر و ضبط کا آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر ریلوے کے دفتر میں کلرک کی۔ تنگی تڑنشی میں عمر بسر کی مگر کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ زمانہ سازی اور مکھن بازی سے اُسے نفرت تھی۔ وہ ایک بڑے مشاعرے میں محض اس لیے شریک نہیں ہوئے کہ اُس کی صدارت ایک گورنر صاحب کر رہے تھے۔ اس مشاعرے سے اُسے سو پچاس روپے ملنے والے تھے مگر وہ نہ مانا۔ شاہینی صفات کا آدمی تھا۔ افلاس کی وجہ سے ظاہر بدینوں نے اُسے حقیر جانا۔ وہ ایک خوددار شاعر تھا اور اپنا ڈھول آپ پیٹنے کا فن اُسے نہیں آتا تھا۔ اس نے زندگی کی سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور زندگی نے اُس سے یوں انتقام لیا کہ اسے ہمیشہ مفلس ہی رکھا۔ کماتا دھماتا کڑیل جوان بیٹا سرا۔ اُس کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کا دل مر گیا۔ مگر وہ زندگی سے لڑتا ہی رہا۔ اُس کی رُوح لہو لہان ہو گئی تھی مگر اُس کی پیشانی پر کوئی ٹیکن تک نہیں تھی۔ وہ اسی طرح مسکراتا رہتا تھا، ہنستا تھا اور فہمے لگاتا تھا۔ جس طرح اب سے بائیس سال پہلے۔ اور ایک ہینہ ہو ا ایک دم سے سنا کہ نہال مر گیا۔ مختصر سی علالت کے بعد اُسے ہسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہ جاں بڑ نہ ہو سکا۔ اور زندگی نے آخر اُسے قبل از وقت موت کی نیند لہی دیا۔

۱۔ میرا بقر علی، خواجہ ناصر زبیر فراقی، نواب سائل اور مرزا حیرت سے متعلق خاکوں کے کچھ اجزا ۱۹۵۲ء میں اور کچھ ۱۹۵۱ء میں لکھے گئے۔ اس مضمون کے باقی تمام خاکے ۱۹۵۸ء میں قلم بند ہوئے۔

شہد احمد دہلوی کے بارے میں

نام	شہد احمد
پیدائش	دہلی - ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء
تعلیم	بی اے (آنرز) ۱۹۲۵ء میں میڈیکل کالج لاہور چھوڑ کر دہلی میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے بی اے (آنرز) کیا۔
شادی	۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء میں عالیہ بیگم سے پہلی شادی ہوئی۔
شادی	ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں عاصمہ بیگم سے شادی ہوئی۔
"ساقی" کا اجرا	جنوری ۱۹۳۰ء
ہجرت	۲۳ ستمبر ۱۹۴۷ء، دہلی سے لاہور آئے۔
لاہور سے کراچی	مئی ۱۹۴۸ء میں لاہور سے کراچی آ گئے۔
کراچی سے "ساقی" کا اجرا	ستمبر ۱۹۴۸ء
ریڈیو پاکستان کی ملازمت	۱۹۴۸ء
پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی	جنوری ۱۹۵۹ء
یونیسکو کی طرف سے تمغائی لینڈ اور فپائن	[
کالثافتی دورہ اور سفر جاپان و ہانگ کانگ		
ادبی خدمات پر صدارتی انعام	۱۹۶۳ء
وفات	۲۷ مئی ۱۹۶۷ء - کراچی
قبر	سندھی قبرستان - کنٹری کلب روڈ - کراچی۔

تصانیف

- گنبدینہ گوہر -- -- -- ۱۷ شخصیتوں پر سوانحی خاکوں کا مجموعہ
- دلی کی بیٹا -- -- -- ۱۹۴۷ء میں دلی کے خونی غسل کا رپورٹناڈ
- اُبڑا دیار -- -- -- دلی پر مضامین کا مجموعہ
- تراجم (ناول - افسانے - ڈرامے - نفسیات وغیرہ)
- فاؤسٹ (ڈرامہ) -- -- گوٹے کے ڈرامے کا ترجمہ
- ترگس جمال (ڈراما) -- -- ماترلنگ
- پروین و ثریا (ڈراما)
- حیرت ناک کہانیاں (افسانے) ہامنڈون کی کتاب "لے ڈنڈر بک" کا ترجمہ
- انوکھی کہانیاں (افسانے) -- -- "ٹینگل وڈ ٹیلز" کا ترجمہ
- دھان کا گیت (ناول) -- -- آئی بی پانگ کے ناول "رائس اسپراؤٹ سونگ" کا ترجمہ
- عثمان بطور (ناول) -- -- ترجمہ
- سرگزشتِ عروس (ناول) -- -- ترجمہ
- پھانسی (ناول) -- -- ترجمہ
- عربی لڑکے جو نامور ہوئے -- (سوانح) بولٹن کی کتاب "لایٹوز آف پورٹو لوانڈا ہونی کیم فیمس" کا ترجمہ
- آپ کے بچے کی صحت -- -- (صحت و طب) گالاگیر کی کتاب "یور چلڈرنز ہیلتھ" کا ترجمہ
- کامیاب باپ (بچوں کی نفسیات) "لے گائیڈ ٹو سیکسیس فل فاؤر ہڈ" کا ترجمہ
- بچوں کے جذباتی مسائل () "ایموشنل پرابلمز آف گروئنگ اپ" کا ترجمہ
- بچوں میں جذبہ عداوت () "ایسکیلون کی کتاب" "ہوسٹیلیٹی ان چلڈرنز" کا ترجمہ
- والدین اور معلمین (بچوں کی نفسیات) گرانٹ کی کتاب "پیرینٹس اینڈ ٹیچرز اینڈ پارٹنرز" کا ترجمہ
- بچوں کے کھیل () "گراسمین کی کتاب" "ہاڈ چلڈرن پلے" کا ترجمہ
- انتخابِ معاش () "ہمفریز کی کتاب" "ہیلپنگ یوتھ چوز کیریئر" کا ترجمہ
- بچوں کی جنسی تعلیم () "کرکینڈل کی کتاب" "ہیلپنگ چلڈرن انڈرسٹینڈ سیکس" کا ترجمہ

بچوں کی دل چسپیاں (بچوں کی نفسیات) کمبوڈر کی کتاب "ایکسپولرننگ چلڈرنس انٹرسٹس" کا ترجمہ۔

تودشناسی (بچوں کی نفسیات) میننگز کی کتاب "سیلف انڈر اسٹینڈنگ" کا ترجمہ۔

بچے کی اخلاقی قدیس () مانٹیگکو کی کتاب "ہیلپنگ چلڈرن ڈیولپ مورل ویلیوز" کا ترجمہ

آپ کے بچے کی وراثت () نیوگارتھی کی کتاب "یور چلڈرنز ہیریڈٹی" کا ترجمہ

بچوں کی نشوونما (بچوں کی نفسیات) اوٹسن کی کتاب "ہاؤ چلڈرن گرو اینڈ ڈیولپ" کا ترجمہ

بچوں کی سیکھنے کی قابلیت بڑھانا (بچوں کی نفسیات) ریولن کی کتاب "امپرورننگ چلڈرنز لرننگ ایبیلیٹی"

کا ترجمہ

بچوں کے خوف (بچوں کی نفسیات) راس کی کتاب "فیئر ز آف چلڈرن" کا ترجمہ

بچوں کی معاشرتی زندگی (بچوں کی نفسیات) ولتیسمین کی کتاب "گائیڈنگ چلڈرنز سوشل گروو تھ"

کا ترجمہ

معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی (بچوں کی نفسیات) لینڈس کی کتاب "ہیلپنگ

چلڈرن ایڈجسٹ سوشلی" کا ترجمہ۔

بچوں کی بدتمیزیاں (بچوں کی نفسیات) لیونارڈ کی کتاب "وہائی چلڈرن مس بی، میو"

کا ترجمہ۔

ان کے علاوہ افسانے، ڈرامے، ناولٹ وغیرہ کے تراجم ہیں جو مختلف رسائل و جرائد

میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کو بھی مرتب و شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

1480

